تعمیرِ حیات

کی

خصوصی اشاعت

بیادگار

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

چند اہم اہلِ قلم

مولانا ابوالحسن علی ندوی
سید صباح الدین عبدالرحمٰن
قاضی زین العابدین
ڈاکٹر مشیر الحق
مولانا ابوالعرفان ندوی
مولانا محمد رابع حسنی ندوی
ڈاکٹر احتشام احمد ندوی
مولانا بدرالدین
محمود الازہار ندوی

شانِ خط مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

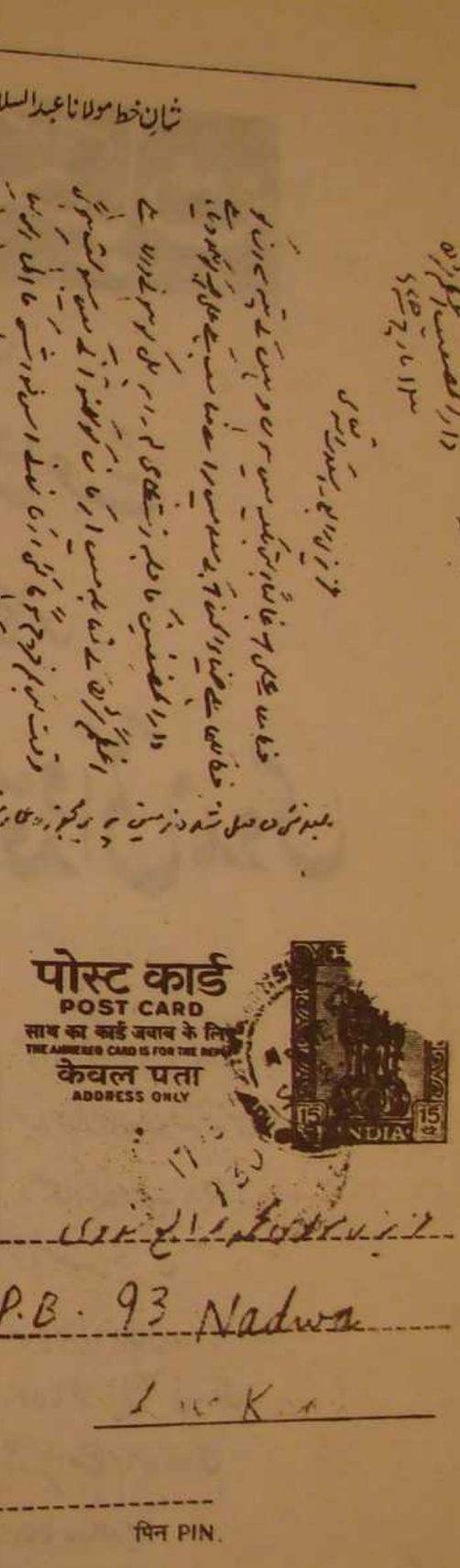

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

حیات وواقعات ایک نظر میں

(۷ مارچ ۱۹۰۷ء ——— ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء)

جائے پیدائش وجائے وفات: تھولینڈی ضلع رائے بریلی

۱۹۲۴ — ۱۹۳۰ دور طالب علمی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۹۳۰ — ۱۹۳۳ دور طالب علمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۱۹۳۳ — ۱۹۳۴ روزنامہ خلافت بمبئی کے عملہ ادارت میں شمولیت

۱۹۳۴ — ۱۹۴۳ استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جنوری ۱۹۴۰ / جولائی ۱۹۴۲ ماہوار "الندوہ" لکھنؤ کی ادارت

مئی ۱۹۴۳ / اگست ۱۹۵۱ بانی ومہتمم ادارہ وتعلیمات اسلام لکھنؤ

۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ / جون ۱۹۵۳ پندرہ روزہ رسالہ تعمیر (ادارہ تعلیمات اسلام) کی ادارت

۱۷ اگست ۱۹۵۱ / ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ استاد اسلامیات وناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ

جنوری ۱۹۶۹ / تاوفات ممبر مجلس ادارت سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، دہلی

۵ اکتوبر ۱۹۷۲ / تاوفات معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء

مارچ ۱۹۷۵ / تاوفات ناظم علمی اور مدیر معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

حسب ذیل اداروں کی مجالس اعلیٰ کے وقتاً فوقتاً ممبر رہے

- مجلس عاملہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
- مجلس عاملہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- مجلس تعلیمی (اکیڈیمک کونسل)۔ مجلس منتظمہ (اکزیکٹیو کونسل)
- انجمن (کورٹ) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
- مجلس عام۔ مجلس عاملہ، اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، دہلی۔

(مرتبہ: ڈاکٹر مشیر الحق ندوی)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

چند حسرتیں ـــــ چند آنسو

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قلب و قلم کو دنیا میں کیسے کیسے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں کہ اگر اللہ ہی ہمت و قوت نہ دے اور ایمان اور رضا بالقضا کا سہارا نہ ہو تو دونوں جواب دے جائیں اور کسی کام کے نہ رہیں۔ ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

انہی تین مہینوں میں دو ایسے عزیز جدا ہوئے جن میں سے ایک لخت جگر تھا، دوسرا قوت بازو، اب یہ تیسرا حادثہ ایک ایسے ہمدم دیرینہ، ایک ایسے دوست و رفیق کی جدائی کا پیش آیا جس کا تقریباً نصف صدی کا ساتھ رہا، ساتھ پڑھا، ساتھ پڑھایا، دارالعلوم کی تعلیم و تدریس اور ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ "الندوہ" (دور سوم) کی ادارت و ذمہ داری، پھر ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام و استحکام اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی خدمت اور عربی زبان کی تعلیم و اشاعت اور اس کے ترجمان اخبار "تعمیر" کی ادارت و ترتیب میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار و شریک حال رہے، پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں (بحیثیت معتمد تعلیمات) ان کے گراں قدر مشورے، دارالمصنفین میں بحیثیت شریک ناظم ان کی قیمتی رہنمائی و اعانت اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی پوری پوری نیابت کس کس چیز کو یاد کیا جائے اور بیک وقت یہ سب مسندیں خالی، اور محفلیں سونی ہو جائیں، تو کس طرح دل کو تسلی دی جائے اور آنکھوں کے سیل رواں کو تھاما جائے۔ ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

عقیدہ و مسلک سے لے کر تاریخ اسلام کے نظریات، قدیم نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں خیالات، ندوہ کے مقاصد اور ان کی صداقت اور اس عہد میں ان کی ضرورت پر غیر متزلزل یقین، اسلام کی دین و دنیا کی جامعیت پر کامل شرح صدر، قدیم و جدید کے صالح و نافع اجزاء کے خوشگوار امتزاج کی ضرورت پر مستحکم عقیدہ، علماء

کے منصب قیادت سے دست کش یا معزول ہو جانے اور دین و سیاست کی تفریق کو زوال امت کا اصل سبب قرار دینے پر پورا وثوق اور اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی شدید خواہش، اصلاح نصاب، علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ کے عمیق و تحقیقی مطالعہ کے ذریعہ علماء کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش یہ سب وہ افکار و خیالات ہیں جن سے مولانا عبدالسلام صاحب عمر بھر وابستہ اور ان کے پرجوش داعی رہے اور جو ان کے عقیدہ کا جزء بن گئے تھے اور جس نے کسی دور میں بھی ان کو ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کی دعوت سے بے تعلق نہیں ہونے دیا، ان مقاصد کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ اور ان کے لیے کوشش کرنے کا سب سے مناسب میدان وہ ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو سمجھتے رہے، آج جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو ان سطور کے لکھنے والے کو اس کے اعلان و اعتراف میں ذرا تامل نہیں بلکہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس نے ان خیالات و نظریات میں مولانا سے بہت کچھ سیکھا اور ان پر اس کے یقین کے مستحکم ہونے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

راقم السطور کہنے کو تعلیم کے آخر مرحلے میں ان کا رفیق درس رہا لیکن دونوں کی عمروں میں کئی سال کا تفاوت تھا، میں جب دارالعلوم آیا تو اگرچہ عربی زبان و ادب کا (عرب اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے) مجھے خصوصی ذوق پیدا ہو گیا تھا، لیکن عام معلومات اور مطالعہ کی وسعت و تنوع میں مولانا مجھ سے بہت فائق تھے، وہ نابغۂ جواں سال و جواں مرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فیض صحبت و تربیت سے (جن سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے) اردو کے ایک اچھے مقرر اور مضمون نگار بن چکے تھے، اور ان کا فکر و شعور بیدار ہو چکا تھا، ۱۹۲۶ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں جہاں میں ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے گیا تھا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی صدارت اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں اور بہت سے مشاہیر ہند اور زعمائے ملت کی موجودگی میں مولانا کی اردو میں تقریر ہوئی تھی، وہ مولانا شبلی مولانا سید سلیمان ندوی اور ندوۃ العلماء۔ اور دارالمصنفین کے پیدا کیے ہوئے لٹریچر پر پورے طور پر حاوی تھے۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کی پوری تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی، ندوۃ العلماء کے بانیوں اور کارکنوں اور ان کے مراتب و درجات سے بھی وہ خوب واقف تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامت طبع، ذہنی اعتدال، تواضع اور شرافت نفس کی دولت سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، اس لیے وہ سب کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے، غلو، مبالغہ اور عصبیت سے ان کو فطری طور پر مناسبت نہ تھی اور دل آزاری اور کسی کی توہین و تحقیر (خواہ وہ ادارہ ہو یا فرد) ان کے مسلک میں کبیرہ گناہ تھا، نصاب تعلیم کے تغیر پذیر اور علوم اسلامیہ کے ترقی پذیر ہونے

پر ان کا پختہ عقیدہ تھا، ان کے نزدیک ان میں زمانہ کا ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے اور اس کے جائز تقاضوں کے پورا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، سیاسی خیالات میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ تھے، ان کا ذہنی نشوونما "الہلال" و "ہمدرد" کے مضامین، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی تقریروں اور تحریک خلافت کے دور میں ہوا تھا، اور ان کے اثرات سے وہ آخر عمر تک آزاد نہیں ہوئے۔

۱۹۳۴ء سے ہم دونوں دارالعلوم کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے، ابتداء میں ان کا تقرر تاریخ واقتصادیات کے استاذ کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ان کو عربی اور دینیات کے اسباق پڑھانے کو مل گئے، مولانا کی طبیعت چونکہ بڑی بے ہمہ و باہمہ واقع ہوئی تھی، ان میں بڑی بے تکلفی و سادگی تھی، طلبہ پر شفقت ان کے ذاتی معاملات سے بھی دلچسپی و ہمدردی اور ان کے ساتھ مساوات کا معاملہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ ضوابط و احکام اور سرزنش و تعزیر سے زیادہ افہام و تفہیم اور نصیحت و تلقین کی افادیت پر یقین رکھتے تھے، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں محبت و ہمدردی اور اخلاق کے اثر کے قائل تھے، اس لیے طلبہ ان سے سب سے زیادہ مانوس اور ان سے قریب ہوگئے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا یہ طرز عمل بعض اوقات منتظمین کے لئے مشکلات کا باعث بن جاتا، اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی، صاف گوئی اور بے تکلفی بعض مرتبہ طلبہ کے لیے وجہ آزمائش بن جاتی، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ چوں کہ ان کے سامنے ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے دارالعلوم کا وہ اونچا تخیل تھا جو اس کے بانیوں نے پیش کیا تھا، اس لئے وہ اکثر طلبہ سے بے تکلف کہہ دیا کرتے تھے کہ "بھئی ہم لوگ اس دارالعلوم میں تعلیم و رہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے لائق نہیں، علمی اور ذہنی حیثیت سے ہم سے کہیں بلند پایہ استاذ دارالعلوم کے شایان شان تھے، مگر کیا کیا جائے کہ قحط الرجال کی وجہ سے یہ خدمت ہم جیسوں کو انجام دینی پڑ رہی ہے۔" یہ بات انھوں نے بار بار کہی، میں نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ "مولانا اب زمانہ اس تواضع و کسر نفسی کا قدرداں نہیں، آپ تو یہ بات تواضعاً کہتے ہیں لیکن طلبہ اس کو نہ صرف حقیقت سمجھ لیں گے بلکہ وہ اساتذہ کو اسی نظر سے دیکھنے لگیں گے، اور اپنے کو مظلوم سمجھیں گے کہ ایسے کم مایہ اساتذہ ان کو پڑھانے پر مامور ہیں، اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچے گا اور اساتذہ کی وقعت ان کی نگاہ میں اور کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے وہ استفادہ سے محروم رہیں گے لیکن یہ مولانا کا مزاج تھا اور وہ اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ نہ صرف درجہ کے استاد تھے بلکہ طلبہ کے اتالیق و نگراں اور ان کے مطالعہ اور علمی ترقی کے مشیر و رہنما بھی تھے، طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کے وہ ناظم بھی رہ چکے تھے اور اس کی افادیت کے بڑے قائل تھے، وہ اس کے اردو کے ذخیرۂ کتب اور رسائل سے فائدہ اٹھانے کا برابر مشورہ اور ترغیب دیتے رہتے تھے، اور ان کی اس ہدایت و ترغیب سے بہت سے ذہین طلبہ نے فائدہ اٹھایا اور وہ اردو کے اچھے مضمون نگار اور صحافی اور مصنف بن گئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ندوۃ العلماء کے ناظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (معتمد تعلیمات مولانا سید سلیمان ندوی) اور مہتمم ان کے استاذ اور شیخ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے، تینوں ان کی صلاحیتوں کے قائل اور ان پر اعتماد رکھتے تھے، جہاں تک مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کا تعلق ہے ان کے تلامذہ میں مولانا عبدالسلام صاحب اور مولوی رئیس احمد جعفری ان کے محبوب ترین و مقرب ترین شاگرد تھے، مولانا سے (جن کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی) انھوں نے بیعت و ارادت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا، طلبہ کے ساتھ اس خصوصی تعلق کی بنا پر طلبہ کے معلوماتی دوروں اور ہندوستان کے تاریخی شہروں اور علمی مرکزوں میں جانے کے لیے طلبہ کے ساتھ بحیثیت نگراں اور سرپرست کے انہی کا انتخاب ہوتا، اس سلسلہ میں وہ طلبہ کو دیوبند، سہارنپور اور لاہور تک لے گئے، ان سب مرکزوں میں طلبۂ دارالعلوم کی بڑی پذیرائی ہوئی، استقبالیہ جلسے ہوئے، جن میں وہاں کے بڑے اساتذہ اور سرپرستوں نے تقریریں کیں، دیوبند میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اور مظاہر العلوم میں مولانا اسعد اللہ صاحب نے تقریر فرمائی اور مولانا نے اس کا موزوں طریقہ پر جواب دیا۔ لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے شفقت و عنایت کا معاملہ فرمایا، ایک مرتبہ مجھے بھی ان کے اور طلبہ کے ساتھ دہلی اور آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، اس لیے ان کی رفاقت سے طلباء کو گراں قدر علمی فائدے ہوئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ) میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حکم سے "الندوہ" کا سہ بارہ اجراء ہوا، اس کی ادارت کے لیے قرعۂ فال ہم دونوں کے نام پڑا، اس وقت اس اشتراک عمل کا ایک دوسرا میدان سامنے آیا، جنوری ۱۹۴۰ء تا جولائی ۱۹۴۲ء تک جاری رہنے کے بعد مالی دشواریوں کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا پڑا، یہ دور تھا جب ندوۃ العلماء مالی بحران کے دور سے گزر رہا تھا، تنخواہوں کا بھی وقت پر تقسیم ہونا مشکل ہو رہا تھا، اس بنا پر ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی ہدایت پر ایک وفد کا جنوبی ہند کا دورہ

طے پایا، یکم مئی ۱۹۳۷ء کو یہ وفد روانہ ہوا، اس وفد کے قائد و سرپرست حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے اور رکن ہم تین، مولانا مرحوم، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نائب مہتمم دارالعلوم اور یہ راقم السطور، اس وفد نے ناگپور اور مدراس کا دورہ کیا، سفر میں ایک دوسرے کا ایسا تجربہ ہوتا ہے جو حضر میں سالہا سال کی یکجائی میں نہیں ہوتا، بہت سی کمزوریاں جن پر پردہ پڑا رہتا ہے سفر میں بے نقاب سامنے آجاتی ہیں، مولانا کی بے نفسی سادگی اور تواضع کھل کر سامنے آئی اور ہم میں سے کسی کو اس طویل سفر میں دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

مولانا کی حدیث پر اچھی نظر تھی، دارالعلوم کے استاد حدیث اور اپنے وقت کے ممتاز محدث مولانا حیدر حسن خاں صاحب حدیث میں ان کے استاذ تھے جنکو حدیث اور علوم حدیث پر عبور حاصل تھا اور اسانید اور رجال پر گہری نظر تھی، _____ استاذ کے تبحر علمی اور شاگرد کے شوق و ذہانت کی وجہ سے ان میں حدیث کا بڑا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کو حدیث کے استناد، اس کے دین کا ایک بنیادی ماخذ ہونے، زندگی میں اس کی ضرورت و افادیت اور محدثین کی اس سلسلہ میں جانفشانی و احتیاط پر پورا اعتماد و وثوق تھا۔ جس وقت انکار حدیث کا فتنہ اٹھا اور ایک اونچے مسلمان سرکاری عہدہ دار نے اس خیال کی تبلیغ و وکالت شروع کی اور اس وقت کے ایک بڑے مقبول ادبی رسالہ "نگار" نے اس کی ترجمانی کا کام اپنے ذمہ لیا تو مولانا نے اس خیال کی تردید کے لیے کہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام بہت تاخیر سے تیسری صدی میں شروع کیا گیا۔ "حدیث کے پانچ اولین صحیفے" کے نام سے ایک محققانہ کتاب لکھی، جس میں یہ ثابت کیا کہ یہ خیال جہالت و ناواقفیت پر مبنی ہے، حدیث کی جمع و تدوین کا کام عہد رسالت ہی میں شروع کر دیا گیا جو مسلسل جاری رہا۔ دارالعلوم میں بھی مولانا نے حدیث کے بعض اسباق لئے اور سنن ابوداؤد بھی پڑھائی۔

پھر ۱۹۴۲ء میں وہ وقت آیا کہ بعض خاص حالات کی بنا پر ان کو دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی یہ ان کے لیے زندگی کا بہت سخت مرحلہ تھا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کا دارالعلوم ان کے دل و دماغ میں ایسا رچ بس گیا تھا اور ان کی زندگی اس سے ایسی مربوط ہو گئی تھی کہ اس سے علیحدگی و کنارہ کشی ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ تھا، اس سے ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوتا تھا جس کا کسی اور چیز سے پر ہونا مشکل تھا، خدا جزائے خیر دے لکھنؤ کے ان چند صاحب ذوق، عالی ہمت عمائد اور حکومت کے اعلیٰ

عہدہ داروں کو جو ان کے درس قرآن میں شرکت کرتے تھے کہ انھوں نے لکھنؤ میں ایک ادارہ کی بنیاد ڈال دی جس کا نام "ادارۂ تعلیمات اسلام" تھا، ان میں پیش پیش سید صغیر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری حکومت یوپی، شیخ ظہور الحسن صاحب ڈپٹی سکریٹری حکومت یوپی (بعد میں ریونیو سکریٹری اتر پردیش) اور سید صغیر حسین صاحب گورنمنٹ ایڈوکیٹ یوپی تھے، اس طرح مولانا کی دارالعلوم کی علیحدگی ایک بڑے خیر کا ذریعہ بن گئی، "ادارۂ تعلیمات اسلام" میں مولانا نے قرآن مجید کے ذریعہ اور کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی زبان سکھانے اور قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے لیئے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے اس کے لیے "عربی زبان کے دس سبق" کے نام سے ایک رسالہ تیار کیا جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا، اور ہزاروں آدمیوں کے عربی زبان سے واقف ہونے اور اس کا طالب علم بننے کا سبب بن گیا، بہت جگہ یہ رسالہ نصاب میں بھی داخل ہے، اور اس کے بار بار ایڈیشن نکلے، اس کے ساتھ انھوں نے تمرین الدروس (۱-۲-۳) اور قرآن مجید کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ لکھنؤ میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے والوں کالجوں میں پڑھنے والوں، اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی کا شوق پیدا ہوا اور بہت سے لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے لگیں، مولانا کی محبت و اخلاق اور سادگی و تواضع نے ان کو اور گرویدہ کیا اور یہ ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے کا ذریعہ بنا۔

ان باقاعدہ اسباق اور جماعتوں کے علاوہ ادارہ میں دو عمومی درس ہوتے تھے، ایک قرآن شریف کا جس کا ذمہ میں نے لیا تھا اور ایک حدیث شریف کا جو اکثر مولانا دیا کرتے تھے۔ قرآن شریف اور حدیث کے درس میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں تک پہنچنے لگی حتیٰ کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا، اور اس کا انتظام عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا، اس وقت اس درس اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کے دن بعد مغرب کسی اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحب ذوق انگریزی داں کو تلاش کرنا ہو تو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے شعور کی تربیت (جس کی ضرورت ۴۲-۴۳ء کے بعد شدت سے محسوس ہونے لگی تھی) اور دینی واقفیت کے لیے "تعمیر" کے نام سے ستمبر ۱۹۴۸ء سے ایک دینی رسالہ کا اجراء بھی عمل میں آیا، مولانا اور راقم السطور کا نام بحیثیت مدیر کے درج ہوتا تھا، اس رسالہ میں بڑے فکر انگیز اور

ایمان افروز مضامین شائع ہوئے اور یہ پرچہ سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ "ادارہ تعلیمات اسلام" ایک ایسا ثقافتی اور تربیتی مرکز بن گیا تھا، جس کی دور دور مثال نہیں تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض ذہین فضلاء جن میں مولانا عبدالغفار ندوی (حال سکریٹری جماعت اسلامی اتر پردیش) علی احمد کیانی مرحوم، مشیر الحق صاحب بحر آبادی (حال ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیات و عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کچھ دن فاضل گرامی عم محترم مولانا سید محمد طلحہ صاحب ایم۔ اے نے بھی وقت دیا اور لوگوں نے ان کے وسیع علم و تبحر سے فائدہ اٹھایا۔

مگر افسوس ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو باد خزاں چلی اس نے اس پھلنے پھولنے والے درخت کو بھی خشک کردیا، اس کی مالی حالت شروع سے غیر مستحکم تھی، اس کا انحصار صرف اس کے بانیوں کی اعانت۔ اور مولانا عبدالسلام صاحب کے جذبہ ایثار و قربانی اور ان کے چند رفقاء کے خلوص و تعاون پر تھا، کچھ عرصہ تک تو مولانا اور ان کے رفقاء نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور اس کو قائم رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن بالآخر حالات کے سامنے ان کو سپر ڈالنا پڑی، وہ چراغ کو تیل بتی کے بغیر زیادہ دن جلا نہیں سکتے تھے یہی زمانہ تھا جب مولانا کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات کی نظامت کی پیش کش ہوئی۔ جامعہ سے ان کے گوناگوں تعلقات تھے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد وہیں چلے گئے تھے اور کئی سال رہ کر انھوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم سے واقفیت میں اضافہ کیا تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ان کے پرانے استاذ اور بزرگ تھے۔ وہ ان کی علمی و ذہنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے واقف تھے، مولانا نے اس کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور رفقاء نے بھی زیادہ مزاحمت نہ کی کہ وہ خود خدمت کا ایک بڑا میدان ہے اور مولانا اپنے مذاق و مزاج اور اپنے ذہن و قلب کی وسعت کی وجہ سے وہاں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا، ۱۹۵۱ء میں وہ جامعہ منتقل ہوگئے، مولانا نے نہ صرف یہ کہ اس شعبہ کے معیار و روایات کو (جس پر کبھی مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقی اور مولانا محمد اسلم جیراجپوری فائز رہ چکے تھے) برقرار رکھا بلکہ اس کے وقار میں اضافہ کیا، وہ بہت جلد وہاں کی مرکزی دینی شخصیت بن گئے، اس شعبہ کی سربراہی کے فرائض کے علاوہ جمعہ کا خطبہ دیتے تھے اور گویا جامعہ کے امور مذہبی کے پورے نگراں و ذمہ دار تھے، وہ اپنی فراخدلی اور فراخ نظری کی وجہ سے قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبول و معتمد بن گئے، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب دونوں ان کے علم، ان کی شرافت اور ان کے خلوص کے قائل تھے۔

وہ عابد صاحب کے رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوگئے اور اس کی کمیٹی کے رکن رکین بن گئے۔ اور آخر وقت تک رہے۔

بالآخر جامعہ سے بھی سبکدوشی کا زمانہ آیا اور وہ بہت اعزاز و احترام کے ساتھ اس سے رخصت ہوئے انھوں نے بقیہ زندگی علم و دین کی خاموش خدمت لکھنے پڑھنے اور اپنے وطن مالوف میں گزارنے کا ارادہ کرلیا ندوۃ العلماء کے وہ قدیم زمانہ سے رکن چلے آرہے تھے، اب اس سے بہتر موقع نہ تھا کہ ان کے علم و تجربہ اور خلوص و دلسوزی سے فائدہ اٹھایا جائے، چنانچہ مجلس انتظامی نے (۲۶ شعبان ۱۳۹۲ھ ۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء) ان کو باتفاق آراء دارالعلوم کا معتمد تعلیمات منتخب کیا اور اسی حیثیت سے انھوں نے ۷۵ء کے پچاسی سالہ تاریخی جشن ندوۃ العلماء میں اپنی فاضلانہ رپورٹ پڑھی، ندوۃ العلماء کے مزاج اور دارالعلوم کی تعلیمی ضروریات سے ان سے زیادہ پورے حلقہ میں کوئی واقف نہ تھا، ندوۃ العلماء کے مقاصد کے بارے میں وہ بڑے ذکی الحس اور غیور واقع ہوئے تھے اور دارالعلوم کو اس کی اسی حقیقی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جو بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی کی تمناؤں اعلانوں اور ان کی تحریروں اور خطوط میں پائی جاتی ہے، ان کو عمر بھر اسی خواب کی تعبیر کے دیکھنے کی تمنا رہی جو ان دونوں بزرگوں اور ان کے باکمال و روشن ضمیر رفقاء نے گزشتہ صدی عیسوی کے آخر میں دیکھا تھا، وہ ہمیشہ اسی پیمانہ سے ندوۃ العلماء کی ترقیات کو جانچتے اور پرکھتے تھے اور اسی نقطۂ نظر سے خود میرا اور دوسرے رفیقوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے ان کے نزدیک ندوۃ العلماء کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ یہ تھا کہ مختلف علوم اسلامیہ کے ماہرین فن اور صاحب تحقیق و نظر عالم پیدا ہوں جو اس عہد انقلاب میں مسلمانوں کی دینی علمی رہنمائی علیٰ وجہ البصیرۃ کرسکیں اور علماء کا اعتماد بحال اور علوم اسلامیہ کے تفوق کا نقش قائم کرسکیں۔ افسوس ہے کہ ان کی وفات کے بعد اب ایسا کوئی آدمی نہ رہا جو خود ذمہ داران و کارکنان ندوۃ العلماء کا احتساب کرسکے اور ان کی خامیوں، اور غلطیوں پر ان کو متنبہ کرے۔ ع

وہ کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ

مولانا ان سب حیثیتوں اور مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا اپنے اپنے موقعوں پر ذکر آیا، اردو کے ایک منجھے ہوئے پختہ کار و کہنہ مشق لکھنے والے تھے، ان کی تحریر میں زبان یا محاورے کی غلطی ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی، انھوں نے اردو کے عناصر اربعہ (مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی

محمد حسین آزاد) اور اساطین ادب کی تصنیفات بچپن سے پڑھیں اور ان کے ذہن و ذوق نے ان کو پورے طور سے اپنا لیا تھا، وہ بعض ہندگیر شہرت رکھنے والوں کی تحریروں میں زبان کی غلطی نکالتے تھے، وہ اودھ کی تہذیب و معاشرت اور خاندانوں کے رکھ رکھاؤ سے خوب واقف تھے، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت اسی انداز سے کرتے تھے جیسا شرفائے اودھ کا دستور رہا ہے، وہ اپنے چھوٹے عزیزوں اور رفیقوں کی پوری حوصلہ افزائی اور قدردانی کرتے اور ان کی ترقی و کامیابی سے خوش ہوتے، ان کو نیک مشورہ دیتے اور چاہتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی کمال و فنی امتیاز پیدا کریں۔

میں بھی ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانہ میں جب تصوف کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے مجھ پر زبان و ادب کی بے حقیقتی کا غلبہ ہوا۔ اور طبیعت ادب و انشاء سے اچاٹ بلکہ بیزار ہونے لگی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ساری دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم کے دائرہ میں محدود کروں گا، اسی زمانہ میں اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ سے پھر اواں تک (جو مولانا کا وطن ہے) میرا ان کا ساتھ ہو گیا۔ میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے، سارے راستے وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے زبان و ادب کی اہمیت کی ضرورت کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے اس منفی رجحان کے نقصانات سے (جو غلو اور مبالغہ سے خالی نہ تھا) مجھے ہوشیار کیا اور تاکید کی کہ میں خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت کو ضائع اور اس کی ناقدری نہ کروں جس سے میں دین کی خدمت میں بڑا کام لے سکتا ہوں، ان کی اس تلقین سے میرے اس خیال میں تزلزل پیدا ہو گیا اور میں اس غلطی سے بچ گیا۔

وہ اگر تصنیف کے کام میں مسلسل حصہ لیتے اور ان کی دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل نہ ہوتیں تو ان کا شمار ہندوستان کے عظیم مصنفوں اور اہل قلم میں ہوتا، ان کا طبعی اور پسندیدہ موضوع تاریخ تھا، اس میں ان کے قلم کے دو نقش "ہماری بادشاہی" (مختصر تاریخ اسلام) اور "ہندوستان کی کہانی" (مختصر تاریخ ہند) اہل نظر سے داد تحسین لے چکے ہیں اور بہت جگہ نصابوں میں داخل ہیں۔

ان کی تیسری کتاب جو ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار اور قیام جامعہ کے زمانہ کی تصنیف ہے "دنیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد" ہے جس میں جاہلیت اور عہد ما قبل اسلام کی تصویر تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قیام دارالمصنفین کے زمانہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی مقبول عالم شہرۂ آفاق

سیرۃ النبیؐ کی تلخیص شروع کی تھی جس کی پہلی جلد تیار ہو گئی۔

مولانا بہت سادہ اُردو لکھتے تھے اور اسی کو پسند کرتے تھے لیکن ان کی تحریر میں خاص حلاوت، روانی اور برجستگی ہوتی تھی "معارف" کے وہ شذرات جو ان کے قلم سے ہیں، وفیات اور مقدمے جو انھوں نے بعض کتابوں پر لکھے ہیں، ان کی طرز تحریر کا دلکش نمونہ ہیں، ان کی تقریر بھی سادہ پر مغز اور پر از معلومات ہوتی تھی، اس میں اتار چڑھاؤ اور الفاظ کی صناعی بالکل نہیں ہوتی تھی خاص طور پر سیرت کے موضوع پر وہ بڑی اچھی تقریر کرتے تھے، حقیقت میں ان کی طبیعت ہر قسم کے تکلفات سے بری تھی، یہ بات بعض اوقات ان کے ساتھیوں اور خوردوں کے لیے تفریح کا موضوع بن جاتی تھی۔

وہ قرآن بھی بہت سادہ پڑھتے تھے، اکثر وہ لطیفہ یاد دلاتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ دارالعلوم کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شوخ اور ذہین طالب علم نے ایک دوسرے طالب علم سے وضو کرتے ہوئے کہا کہ "جلدی کرو آج نماز اُردو میں ہو رہی ہے"۔ اکثر مسکراتے ہوئے کہتے تھے میں تو نماز بھی اُردو میں پڑھاتا ہوں لیکن ان کا یہی وصف جو دوسروں کی نگاہ میں بعض اوقات نقص معلوم ہوتا، حقیقت پسندوں کی نگاہ میں اس دور تصنع و تکلف بلکہ دور نفاق و ریا میں بڑا کمال اور قابل رشک صفت تھی۔

پھر جب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات سے دارالمصنفین میں مسند سلیمانی دوبارہ خالی ہوئی تو پھر پورے دبستان شبلی اور بزم سلیمانی میں نظر انھیں پر پڑی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالمصنفین میں قیام اختیار کریں اور "معارف" کی ادارت اور رفقاء کی رہنمائی و تربیت میں ان دونوں گرامی مرتبت پیش رووں کی نیابت کریں، اس درخواست میں میں پیش پیش تھا، آخر میں میرا اصرار ان کی معذرت پر غالب آیا اور انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو اس سے بڑی تقویت اور مدد ملی، ان کو مولانا کی موجودگی میں اور زیادہ دلجمعی اور سکون خاطر کے ساتھ ادارہ کی توسیع و ترقی کا موقع ملا اور اسی اطمینان کی بناء پر وہ کئی کئی مہینے دارالمصنفین سے باہر رہ کر اس کے مالی وسائل کی فراہمی میں ساعی و سرگرم رہے اور وہ خلا نہیں محسوس ہونے پایا جو ایک صاحب نظر عالم دین کی (جو اصل دینی و عربی مآخذ پر براہ راست نظر رکھتا ہے اور علوم اسلامیہ میں اس کی نظر وسیع و گہری ہے) غیر موجودگی میں ایسے ادارہ میں محسوس ہو سکتا ہے جس کا مزاج دینی و علمی ہے اور جس کا خمیر سیرت و تاریخ اسلام سے اٹھا ہے۔

یہ تو ان کی علمی حیثیتوں اور کمالات کی طرف چند اشارے تھے، ان کی تمام صفتوں پر جو صفت میرے

نزدیک سب پر غالب تھی وہ ان کی شرافت نفس، انسان دوستی، بے آزاری اور عام ہمدردی کی صفت تھی، اللہ نے ان کو بچوں کی سی معصوم فطرت دی تھی، وہی بے ساختگی، وہی بے تکلفی کسی کو نقصان پہونچانے، کسی کا دل دکھانے کی یا تو ان میں صلاحیت نہیں تھی یا تھی تو بہت محدود جس کو انھوں نے شاید عمر بھر استعمال نہ کیا ہو، ہر ایک سے محبت و سادگی سے ملنا، اس کا حال احوال پوچھنا، اس کی ضرورتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرنا، اس کی مدد کرنے کی خواہش اس چیز نے ان کو اپنے قصبہ میں بھی اور جہاں جہاں وہ رہے بڑا محبوب اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا، اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب ان کی وفات کی خبر قصبہ پر بجلی بن کر گری، اس وقت ہندو مسلم سب سوگوار نظر آتے تھے، سب ان کی شفقتوں کو یاد کر کر کے روتے تھے مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی ان کے دروازہ پر جمع ہو گئے اور جب تک جنازہ نہ اٹھا وہ وہاں سے ہٹے نہیں، عید کا دن تھا اور نماز کا وقت لیکن ایک شخص بھی ان کے جنازہ کو چھوڑ کر عیدگاہ نہیں گیا، اللہ نے ان کو موت بھی ایسی نصیب فرمائی جس کی اولیاء اللہ دعائیں اور تمنائیں کرتے ہیں۔ رمضان کی ۳۰ تاریخ کو جمعہ کے دن اذان کے وقت ان کی روح نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی اور یکم شوال کو عین عید کا دوگانہ ادا کرنے کے بعد ہزاروں کے مجمع نے جس میں اطراف و نواح کے بھی لوگ تھے ان کو سپرد خاک کیا، عید کے دن جو مسلمانوں کے لیے خوشیوں کا دن ہوتا ہے راقم سطور کے لیے مقدر تھا کہ عین نماز کے بعد اپنے نصف صدی کے ساتھی، شریک کار اور غم گسار کو سپرد خاک کرے اور جس دن دوست دوستوں سے عید ملتے ہیں اس دن ایک دوست کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہی جائے، ادھر کئی سال سے ان کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ عید کی شام کو یا دوسرے دن رائے بریلی آتے۔ وہ اعظم گڑھ سے اس پروگرام کی اطلاع دے چکے تھے لیکن بجائے اس سفر کے انھوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ وما عند اللہ خیر وابقیٰ۔

انتقال کے ۲-۴ دن بعد جب تعزیت کے سلسلہ میں دوبارہ جانا ہوا تو یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ ان کا غم تازہ ہے، ہندو مسلمان دونوں یکساں طریقہ پر مغموم و متاثر نظر آتے ہیں، غیر مسلم اُن کی محبت و شفقت کی باتیں یاد کر کے روتے ہیں اور ان کے واقعات سناتے ہیں، گویا انھوں نے اس شعر پر عمل کیا ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو — ہمہ خنداں بدند تو گریاں
پس چناں زی کہ بعد مردن تو — ہمہ گریاں بوند تو خنداں

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے درجے بلند کرے کہ وہ اچھے رہے اچھے گئے، لیکن اب ہم غم نصیبوں کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ ان کی خالی کی ہوئی جگہ کس طرح پُر کریں اور اُن اداروں کو پھر اُن جیسا باکمال اور جامع صفات آدمی کہاں سے ہاتھ آئے۔

علم و سیاست

یونانی فلسفہ کے رواج کے زمانہ میں تو صرف علمی طور پر مسلمان اس سے متاثر تھے، سیاسی میدان میں ان کی بالادستی قائم تھی اور چین سے مراکش تک عباسیوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور اسپین سے فرانس اور اٹلی کے حدود تک خلفاء اندلس کا جھنڈا اڑ رہا تھا، اس بناء پر وہ احساس کمتری سے محفوظ تھے اس لئے علماء اسلام کو صرف فلسفۂ یونان کی کمزوری واضح کرنی تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ ہی کچھ اور تھی، اس زمانہ میں سیاسی میدان میں بھی یورپ کا بول بالا تھا۔ مسلم ممالک یا تو زیر ہو چکے تھے یا زیر کئے جا رہے تھے، اور سیاست و معیشت، تہذیب و تمدن اور علم و فن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو یورپی اثرات سے محفوظ ہو۔ ایک طرف یورپین فوجیں مسلمان ملکوں کو فتح کرتی جا رہی تھیں دوسری طرف مغربی مفکرین کے خیالات و عقائد، اعمال کی دنیا میں تہلکہ برپا کئے ہوئے تھے۔ تیسری طرف مسیحی مشنری انجیل ہاتھ میں لئے شہروں اور گاؤں میں پھر رہے تھے اور پریشان حال مسلمانوں کو آسمانی بادشاہت کی بشارت سنا رہے تھے، اور دنیا میں مصائب و آلام سے نجات دلا کر عزت و آرام سے زندگی بسر کرنے کا یقین دلا رہے تھے، ان کی طرف سے غریبوں کی امداد کے لئے محتاج خانے، بیماروں کے علاج کے لئے شفاخانے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اسکول و کالج کھلے ہوئے تھے جن پر بے دریغ دولت صرف کی جا رہی تھی۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

آہ مولانا عبدالسلام قدوائی !

سید صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین اعظم گڑھ

آنکھیں اشکبار ہیں، دل اندوہ وغم کا جو بار ہے، جب یہ قلم فگار ہو کر لکھ رہا ہے کہ مولانا عبدالسلام قدوائی جو دارالمصنفین کی علمی اور نجی مجلسوں کی رونق، عزت اور آبرو تھے، ہم سب کو چھوڑ کر یکایک آغوش رحمت الٰہی میں چلے گئے۔

وہ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اس وقت آئے جب جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی رحلت سے یہاں کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، سوگوار اور بے رونق ہو رہا تھا، وہ یہاں آئے تو اپنے جلو میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی بے پناہ عظمت، اپنے اُستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی غیر معمولی عقیدت، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی شخصیت سے اپنی مخلصانہ محبت اور خود اپنی ذات کی لینت، مروت اور ملاطفت کا لشکر ساتھ لائے، اور اس راقم سے ایسے گھل مل گئے کہ ہم دونوں کے درمیان شیر و شہد کی کوثر بہتی نظر آنے لگی، اُن کی آمد سے دارالمصنفین کی سرگرمیوں میں شادابی، اس کی امیدوں کے پھولوں میں رعنائی اور اُس کی تمناؤں کے مرغزاروں میں دل فریبی پیدا ہونے لگی۔ مگر معلوم نہیں مصلحتِ خداوندی کیا تھی کہ دارالمصنفین کے رفقاء اُن کی علمی بصیرت اور بزرگانہ الفت سے ہر طرح کا استفادہ کر رہے تھے کہ وہ اچانک دائمی طور پر اُن سے جدا ہو گئے، وہ ۲۷ رمضان المبارک کو تراویح پڑھ کر اور تہجد اور فجر کی نماز ادا کر کے چار بجے صبح اعظم گڑھ سے اپنے وطن ٹھلیڈی ضلع رائے بریلی عید منانے روانہ ہوئے، وہاں پہنچنے کے دوسرے روز سحری کے وقت اٹھے، یکایک بے ہوش ہوئے اور جمعہ کے روز گیارہ بجے دن کو اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے دن عید کی نماز کے بعد ان کی طالب علمی کے محبوب اور شفیق ترین ساتھی اور اسلامی ممالک کے فاضل اجل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اُن کے سات سوگوار بیٹوں اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی، اور وہیں گوناگوں خوبیوں کا یہ مجسمہ سپرد خاک کر دیا گیا۔

اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۰۶ء تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیل علوم کے بعد مزید تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ دہلی

حرائد
۴۳۶۵
۵۴۰۴۱

گئے، وہاں سے بمبئی کے اس زمانہ کے مشہور اخبار خلافت کی مجلس ادارت میں شریک ہو گئے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں ندوہ میں مدرس کی حیثیت سے بلا لیے گئے۔ لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا، جہاں تعلیم یافتہ حضرات کو کلام مجید کا درس دیتے، اور آسان ریڈروں کے ذریعے سے عربی سکھاتے، یہاں سے ایک جریدہ تعمیر بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ شائع کرتے رہے، پھر جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں اکیس سال تک اس درس گاہ کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرتے رہے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ندوہ کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے، پھر جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد مولانا ابوالحسن علی کی خواہش پر دارالمصنفین کی کشتی کے دیدبان بن کر آئے۔

ان تینوں اداروں سے اُن کو عشق رہا، ندوہ اُن کی لیلیٰ تھی، جامعہ ملیہ اُن کی عذرا تھی دارالمصنفین اُن کے لیے شیریں بنا ہوا تھا، یہاں فرہاد بن کر اس کے لیے جوے شیر نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی فکر کا تیشہ لیے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اُن کی شخصیت ایک عطر مجموعہ تھی، وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست، بہت اچھے شاگرد بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، اُن کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو اُن کے سویدائے دل کے اندر حسین اور شامہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری ڈلی چبا رہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں، جس کے ساتھ رہیے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب، ندوہ میں اُن کے ہم درس رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جو اُردو کی بے شمار تصانیف کے مشہور مصنف ہوئے، اُن سے بچھڑے ہوئے خدا جانے کتنی مدت گزر چکی تھی، مگر شاید ہی کوئی روز ایسا گزرتا، جب وہ اُن کی یادوں کی برات نہ سجاتے، مولانا ناظم ندوی بھی ان کے ہم درس تھے، اب وہ کراچی میں ہیں، ان کا تذکرہ آتا تو کہتے کہ ان سے ایک بار ملاقات ہو جاتی تو پھر دنیا سے جانے کا افسوس نہ ہوتا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ان کا ساتھ رہا، ان کی ہر دلعزیزی کے جلووں، انکی محبوبانہ اداؤں، اور ان کی علمی دلربائیوں کا تو وظیفہ پڑھتے رہتے۔

اُن کے تین محبوب استاد تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حیدر حسن خاںؒ اور مولانا شبلی جیراجپوری مرحوم ان تینوں کا ذکر خیر اس طرح کرتے، جیسے ابھی ابھی اُن سے مل کر آئے ہیں، سید صاحبؒ کی گھریلو زندگی کے کچھ واقعات ایسے سناتے کہ ان کی خبر مجھ کو بھی نہ تھی، حالانکہ مجھ کو اُن کے گھر کے اندر بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وہ

سید صاحبؒ کی علمی جلالت کے بے حد قائل تھے، کہتے کہ ان کے ایسا روشن دماغ اور دیدہ ور عالم عرصۂ دراز تک پیدا نہ ہو سکے گا، وہ مولانا حیدر حسن خاںؒ سے گرویدہ ہو کر اُن سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اُن کی آن بان اور تدریسی شان کا ذکر مزے لے لے کر کرتے، معارف میں اُن پر جو مضمون لکھا تو لکھتے وقت اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی فکر میں رہے، انھوں نے مولانا شبلی جیراجپوری پر بھی معارف میں ایک مضمون لکھا تو اُن کے پاس خطوط آئے کہ مولانا مرحوم کی اصلی عظمت اس مضمون سے معلوم ہوئی۔

کلام مجید کا درس دینے اور عربی زبان سکھانے میں ان کو خاص لذت ملتی، تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں، اور ادبی بذلہ سنجیوں کے ساتھ کلام پاک کے رموز و نکات مزے لے لے کر بیان کرتے، چالیس روز میں عربی سکھا دیتے، ان کے عربی کے قاعدے ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہیں، بچوں کی ذہنی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، دارالمصنفین سے بچوں کے لیے ان کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئیں جو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہتی ہیں، وہ جہاں بھی رہتے، اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، ان کی خاطر اربابِ حل و عقد سے بھی اختلاف کرتے، چاہے وہ ان کے عزیز دوست ہی کیوں نہ ہوتے۔

وہ ایک شفیق شوہر بھی تھے، ان کے دوستوں کی بیویوں کو رشک ہوتا کہ اُن کے شوہر بھی اُن ہی کی طرح ہوتے، ان کے بچے ان کی شفقت و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں جس طرح پلے، کم بچے اپنے باپ کے زیر سایہ اس طرح پلے ہوں گے، ان کے یہاں دھتکار اور پھٹکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، اُن کے پیار اور چمکار سے اُن کے گھر کی فضا خوشگوار بنی رہتی۔

اُن کی خطابت کی بھی عجیب دلربایانہ شان تھی، جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تو معلوم ہوتا کہ

ع بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

وہ چٹکلے اور گھریلو قصے بیان کر کے اُن کو کلام پاک کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ اُن سے نہ صرف اُن کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی فضا پیدا ہو جاتی، بلکہ سامعین بھی اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے، دارالمصنفین اُن کے خطبے کی وجہ سے بھی بیت الحکمت اور مذہبی تربیت گاہ بن گیا تھا۔

ان کا علمی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا جو کچھ پڑھا تھا، مستحضر رہا۔ کلام پاک، تفسیر، حدیث، رجال، علم کلام

تصوف، تاریخ، ادب، سیاست حتیٰ کہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر جب کبھی گفتگو آجاتی تو کچھ نہ کچھ ایسے نکتے بیان کر جاتے کہ یکایک ذہن کے دریچے کھل جاتے، یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ راقم نے ان کے بعض ایک دو جملوں پر معارف کے لیے لمبی لمبی تحریریں لکھیں، وہ علمی مشورے کچھ ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں، وہ علمی کاوشوں کے لیے جس طرح اکساتے، خفتہ علمی جذبات کو جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے، وہ نہ صرف میرے بلکہ دارالمصنفین کے لیے بڑی دولت رہی، وہ ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علمی بصیرت کا درس لیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی صلاحیت ہو،

وہ مسلمان اور عصری تقاضے، سورۂ بقرہ کی تفسیر، ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، عربی کے دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، (پارہ الم) اور قرآن مجید کی دوسری کتاب (سیقول) وغیرہ کے مصنف تھے مگر میرے لیے وہ بہت سی اور یادیں بھی چھوڑ گئے ہیں، اُن کا وہ درد بھی یاد آئے گا جو دارالمصنفین کے لیے اپنے پاک اور بلور کی طرح جھلکتے ہوئے دل میں رکھتے تھے، وہ لمحات بھی یاد آئیں گے جب ہم دونوں دارالمصنفین کے سبزہ زار پر بیٹھ کر اس کے مستقبل کو سوچتے وہ سامنے کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ اس ادارہ کی علمی روایات میں گلاب ہی کی شادابی اور رنگینی رہی ہے، کیا وہ آئندہ بھی باقی رہے گی، پھر مایوسانہ لہجے میں کہتے کہ دارالمصنفین کے اسلاف نے خدمت اور ایثار کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اب نہیں ملیں گے، یہ پیسے کے پیچھے دوڑ لگانے کا دور ہے مگر وہ اس مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کرتے، کبھی چاندنی راتوں میں ہم دونوں دارالمصنفین کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، تو وہ بشارت دیتے کہ ہم لوگوں کو پر امید رہنا چاہیے۔ اس علمی مرکز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی انشاء اللہ برابر چھٹکی رہے گی۔

وہ حوصلہ افزائی کرنا خوب جانتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات سے میرا سینہ اندوہ و غم کا آتشدان بنا ہوا تھا، مگر انھوں نے اپنی مدھری باتوں سے اس کو امیدوں کا گلزار بنا دیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد پھر یہ سوز غم کا تنور بن جائے گا، یہ اب ایک گنجِ شہیداں بن چکا ہے، اس میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، اور اب مولانا عبدالسلام قدوائی مدفون ہیں، میری حیثیت اب ایک مجاور کی ہے، جو اپنے سینے کے قبرستان میں اُن کی یادوں کا لوبان جلانے کے لیے رہ گیا ہے۔

چوالیس سال پہلے دارالمصنفین آیا تو اس کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وجہ سے علم کا

عشرت کدہ سمجھنے میں لذت محسوس کی، پھر مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے زمانہ میں بھی اس کو اپنے لیے علم کا گل کدہ سمجھتا رہا، مولانا عبدالسلام قدوائی کی رفاقت سے بھی میرے لیے علم کا خم کدہ بنتا جارہا تھا مگر اب زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ کہیں مجھ کو خود یہ نہ کہنا پڑے۔

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی نیکیاں اور خوبیاں اُن کے سفر آخرت کے لیے زادِ راہ ہیں، دعا ہے کہ ان ہی کی بدولت مغفرت کی کوثر و تسنیم سے ضرور سیراب ہوں، آمین، ثم آمین، ان کی سیرت کی رعنائیوں ان کے کردار کی دل آویزیوں، اور ان کی گوناگوں خوبیوں کو سلام اور لاکھوں سلام بھیجتا ہوں تو اس وقت دارالمصنفین کی ہر سمت سے یہ صدا سنائی دیتی ہے:

ع گلے برفت ناید بصد بہار دگر

دین و دنیا

مسلمان جب عرب کے سادہ ماحول سے باہر نکلے اور رومی و ایرانی تہذیب اور یونانی علوم و فنون سے سابقہ ہوا تو نئے افکار و خیالات اور نئے انداز و اطوار سامنے آئے اور آہستہ آہستہ زندگی ان سے متاثر ہونے لگی لیکن جب عباسی عہد میں حکمائے یونان کی کتابوں کے ترجمے عربی میں شائع ہوئے تو فلسفہ و حکمت کے مسائل نے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا کردی اور مذہبی عقائد و اعمال کے بارہ میں بحثیں ہونے لگیں اور عملی موشگافیوں نے طرح طرح کے شبہات پیدا کردئے۔ پرانے بزرگ اس صورت حال سے کڑھتے تھے لیکن خاطر خواہ اس کا تدارک نہیں کرپاتے تھے۔ فلسفہ کی راہ سے جو اعتراضات ہو رہے تھے اُن کا جواب وہ لوگ کس طرح دے سکتے تھے جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا تھا، بالآخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ علوم دین سے تعلق رکھنے والے فلسفہ و حکمت کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل کریں تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر دینی مسائل کی ایسی تشریح کرسکیں جو نوجوانوں کی خلش مٹا سکے اور فلسفہ کے اعتراضات کا جواب فلسفہ کی زبان میں دیا جاسکے۔ (مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

رفیق شفیق مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم

۳۳۶۵
۵۴۰۴

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

محب مکرم مولانا عبدالسلام قدوائی جنہیں مرحوم و مغفور لکھتے ہوئے قلم رُکنے لگتا ہے اور دل بجھنے لگتا ہے، گذشتہ رمضان المبارک کی آخری تاریخ کو داغ مفارقت دے گئے۔

غالباً عید سے اگلے روز نامہ "الجمعیۃ" دہلی میں یہ خبر نظر سے گزری اور تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

جولائی ۵۸ء کے وسط میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جامعہ کالج کے اسٹاف میں شامل ہوا اور مولانا مرحوم کی رفاقت کا فخر مجھے حاصل ہوا، اور غالباً اپریل ۷۲ء تک جب مولانا جامعہ سے ریٹائر ہوئے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح چودہ پندرہ سال تک ہم دونوں نے ایک ہی ادارہ کے ایک ہی شعبہ (اسلامک اسٹڈیز) میں دوش بدوش کام کیا۔

جامعہ آنے سے پہلے مولانا قدوائی سے معمولی تعارف تھا، ایسا ہی تعارف جیسا ارباب قلم کے حلقوں میں ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی زمانہ میں لکھنؤ گیا تھا اور امین آباد پارک کے بازار سے گزر ہوا تو ایک کمرہ پر "ادارۂ تعلیمات اسلام" کا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ ادارہ کے نام اور کام سے کچھ تھوڑی سی واقفیت تھی۔ کمرہ کا دروازہ پیچھے گلی میں تھا۔ اوپر چڑھ گیا۔ کمرہ میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا اور الماریوں میں کچھ کتابیں لگ رہی تھیں۔ مولانا جو اس ادارہ کے مدیر تھے بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور بڑی محبت سے چائے پلائی۔ عربی زبان کی تعلیم کو سہل اور عام کرنے کے موضوع پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا اس مقصد کے لئے "عربی کے دس سبق" اور چند دوسرے رسالے لکھے تھے اور ادارہ میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو عربی زبان سکھانے اور اسلامی تعلیمات سے واقف کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں نے بھی "کلام عربی" کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی تھی۔ موضوع دونوں کی مشترک دلچسپی کا تھا۔ یہ مختصر سی ملاقات تھوڑی دیر رہی تھی۔ مگر میں اسے بھولا نہیں تھا۔

کالج کھلنے کے پہلے ہی دن، دوپہر کے وقت کالج کے لان میں ملاقات ہوئی، مولانا بڑی محبت سے ملے اور جامعہ میں میری خلاف توقع آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جامعہ میں میری آمد، خود میرے لئے بھی خلاف توقع تھی۔ میں اس زمانہ میں میرٹھ اپنے وطن سے ماہ نامہ "الحرم" نکالتا تھا۔ کچھ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ تھا اور اپنی کتابیں، اپنے مکتبہ سے شائع کرتا کرتا تھا اس کے علاوہ کچھ آبائی دینی ذمہ داریاں بھی انجام دینی پڑتی تھیں۔ رسالہ اور کتابوں کی طباعت کا مکمل کام دہلی میں انجام پاتا تھا اور اشاعت میرٹھ سے ہوتی تھی۔ اسی دوران ایک مخلص دوست نے بر سبیل ملاقات تذکرہ فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہاں کے ممتاز استاذ مولانا محمد اسلم جیراج پوری کی وفات سے تفسیر و تاریخ اسلام کے پروفیسر کی جو جگہ خالی ہوئی ہے اور دو سال سے خالی پڑی ہے، اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لئے پرنسپل کالج اعزاز الدین خاں اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب سے تحریک کروں۔ میں نے جواب کے لئے کچھ مہلت طلب کی۔ میں نے غور کیا۔ چونکہ میرے اشاعتی و طباعتی کام کا زیادہ تر تعلق دہلی سے تھا پھر دہلی اور میرٹھ کے درمیان صرف بہ میل کا فاصلہ تھا، نیز جو کام جامعہ میں مجھے انجام دینا تھا، اس میں دو تین گھنٹے روزانہ سے زیادہ کی مصروفیت نہ تھی اور تنخواہ بھی اس زمانہ کے لحاظ سے معقول تھی، اس لئے میں نے غور کرنے کے بعد اپنے دوست کو ارباب جامعہ سے گفتگو کی اجازت دیدی۔ پرنسپل صاحب اور شیخ الجامعہ سے مختصر ملاقات کے بعد فوراً ہی میرے پاس شیخ الجامعہ کا خط آگیا جس میں مجھے اس وقت کے جامعہ کے سینیئر گریڈ میں جامعہ کالج کے شعبہ اسلامیات کی پروفیسری کی پیشکش کی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے تو نہیں مگر میری کتابوں سے متاثر ہو گئے تھے جن کو میں ملاقات کے وقت ان کی خواہش کے مطابق ساتھ لیتا گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرے تقرر سے مولانا کی کچھ حق تلفی ہوئی تھی، مگر غالباً تعطیلات کے بعد جب وہ جامعہ تشریف لائے تو ان کو اچانک میری آمد کا علم ہوا، وہ مجھ سے بڑی بشاشت اور تپاک کے ساتھ ملے اور صرف یہ فرمایا کہ "مجھے خیال نہ تھا کہ آپ بھی جامعہ آنا چاہیں گے"، پھر ہمیشہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ محبت، کرم، اخلاص اور ایثار کا رہا۔ وہ میری بڑی لڑکی کی شادی میں میرٹھ بھی تشریف لائے۔ پھر ہمیشہ دوبارہ میرٹھ آنے کا شوق ظاہر کرتے رہے۔ کام کی تقسیم کے سلسلہ میں طریقہ یہ رہا کہ انٹرمیجیٹ اور بی۔ اے کی دو دو کلاسوں میں سے، ترتیب وار، ایک دن ایک کلاس میرے پاس رہتی تھی اور دوسری ان کے پاس۔ پھر دوسرے سال برعکس (ایم۔ اے کی کلاسیں جاری نہیں ہوئی تھیں) اپنے شعبہ کا ٹائم ٹیبل ہم دونوں مل جل کر بنا لیتے تھے اور کوئی اہم کام ایسا نہ تھا جس میں مولانا میری رائے معلوم نہ کر لیتے ہوں۔ مولانا بڑے حلیم الطبع، متواضع اور شیریں کلام تھے۔ گفتگو کا انداز بڑا متواضعانہ اور مخلصانہ تھا اس لئے پندرہ سال کی طویل معاصرانہ رفاقت

میں کبھی کشمکش اور آویزش کی صورت پیش نہ آئی۔ اور ہم دونوں کے تعلقات محبانہ و مخلصانہ رہے۔

مجھے اپنے متعلق اعتراف ہے کہ میں تیز مزاج ہوں، مگر میرے مزاج کی تیزی مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی نرمی کے ساتھ مل کر نقطۂ اعتدال پیدا کر دیتی تھی اور جلد ہی مجھے ندامت اور معذرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جانا پڑتا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جب مولانا سے ملاقات ہوتی مولانا اکثر فرماتے "قاضی صاحب ہم اور آپ اتنی مدت ساتھ رہے کبھی ہمارے درمیان اَن بن نہیں ہوئی"۔ میں اس کی تصویب کرتا، مگر کہہ دیتا مولانا اس کا کریڈٹ آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ مولانا مسکرا کر فرماتے نہیں یہ بات نہیں ہے۔

دراصل مولانا اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم مزاج تھے جن کا قول تھا "اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی تعلق ہو تو میں اس کو منقطع نہیں ہونے دیتا۔ جب وہ اسے کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں"۔ پھر مولانا قدوائی مرحوم جو کچھ زبان سے فرماتے تھے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی تھی۔ ریا اور نفاق آج ہمارے معاشرے کے عام مرض ہیں جن سے نہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب محفوظ ہیں نہ ہمارے اہل علم اور دیندار طبقہ کے لوگ۔ مولانا کو اس مرض کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ان کی زبان جتنی شیریں تھی دل بھی اتنا ہی صاف تھا، میں نے کبھی نہیں سُنا کہ انہوں نے پسِ پشت بُرائی کی ہو۔

ابھی ان کے صاحبزادے مولوی محمد سالم قدوائی کا علی گڑھ سے خط آیا ہے جو میرے تعزیت نامہ کے جواب میں ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں،

"آپ ان سے اور وہ آپ سے جامعہ کی زندگی میں بہت قریب رہے، ہمیشہ آپ کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کرتے تھے"۔

یہ محض مولانا کی عالی ظرفی تھی ورنہ "من آنم کہ من دانم"، میری ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میرے اور مولانا کے درمیان اگرچہ مادر علمی کا اشتراک نہ تھا وہ ندوۃ العلماء کے فاضل تھے، اور میں دار العلوم دیوبند کا فیض یافتہ مگر مسلک و مشرب کے لحاظ سے ہم دونوں بہت قریب تھے۔ مولانا، شاہ ولی اللّٰہی حنفی تھے، یعنی فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حدیث صحیح کو نظر انداز نہیں کرتے تھے میں بھی اس کو اہمیت دیتا ہوں۔

وہ بدعات سے نفور تھے میرا بھی مزاج کچھ ایسا ہی ہے۔ مولانا اسلامی جماعتوں میں جمعیۃ علماء سے زیادہ قریب تھے میرا بھی یہی طرز عمل ہے البتہ وہ مجھ سے کچھ بڑھ کر پکے کانگریسی بھی تھے۔ چنانچہ ہمیشہ گاندھی کیپ اور گاڑھے کے کپڑے استعمال کرتے رہے۔

تحریک خلافت کے زمانہ شباب میں ان کے تعلیمی دور کا آغاز ہوا، کسی زمانہ میں اپنے رفیق درس مولوی رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم کے ساتھ مل کر اخبار "خلافت" بمبئی کے ادارتی فرائض بھی انجام دیے۔ انکی کانگریسیت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی زمانہ کی دین تھی۔ وہ اکابر جامعہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے جن کو گاندھی جی کے معتقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ان اساتذہ کو ان پر فخر اور اعتماد تھا۔

ندوۃ العلماء میں انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ آکر انہوں نے انگریزی اور علوم جدیدہ کی تحصیل کی تھی۔ اس لئے تفسیر وحدیث وفقہ میں عالمانہ بصیرت کے ساتھ ان کو حالات زمانہ اور عصری ضروریات سے واقفیت بھی تھی۔ چنانچہ عصر جدید کے پیدا شدہ مسائل، فقہ اسلامی کی تدوین جدید، موجودہ معاشی مسائل کے اسلامی حل، ہندوستانی سیاسیات میں مسلمانوں کی راہ عمل، قدیم تعلیمیافتہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے درمیان فکری وعملی ارتباط کی ضرورت، عربی مدارس کے قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح جیسے مباحث میں مولانا کی رائے بڑی معتدل، متوازن اور مبصرانہ ہوتی تھی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب فکر اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ عصر جدید اور اسلام سوسائٹی کے سمیناروں اور اس کے آرگن "عصر جدید اور اسلام" ان موضوعات پر ان کے جو مقالات اور مضامین پڑھے گئے اور شائع ہوئے، وہ جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ پسند کئے گئے۔ وہ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کی قائم کردہ اس سوسائٹی کے رکن اور اس کے ترجمان عصر جدید اور اسلام کے ادارتی بورڈ کے رکن بھی تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اس ادارہ کے لئے اسلامی افکار وتعلیمات پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔

ان کا انداز تحریر، سادہ مگر شگفتہ موثر دل نشیں اور فکر انگیز ہوتا تھا۔ مختصر الفاظ میں، سہل طریقہ پر کام کی بات کہنا پسند کرتے تھے۔ الفاظ کی طلسم بندی اور عبارت آرائی ان کی تحریر میں نہ ہوتی تھی۔ ان کی تقریر کا بھی انداز یہی تھا۔ جامعہ کے سیرت کے جلسوں میں اور جمعہ کے دن خطبہ میں وہ تقریر فرمایا کرتے

تھے۔ کوئی آیت یا حدیث پڑھ کر اس کی آسان زبان میں تفسیر وتشریح فرماتے اور مختصر الفاظ میں ایسی کام کی باتیں بیان کرتے جو عقیدہ وعمل کی اصلاح میں کارگر ہوتیں، میں نے ان کی کوئی تقریر آدھ گھنٹہ سے زیادہ کی نہیں سنی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دانشور جو دینی معاملات میں اختصار پسند ہیں ان کی اس ادا کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ بھی مختصر اور محدود ہی رہا۔ ان کی کتابیں ہماری بادشاہی (مختصر تاریخ اسلام) اور ہندوستان کی کہانی (مختصر تاریخ ہند) جامعہ کے دور سے پہلے کی ہیں اور سہولت اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکثر مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

جامعہ آنے کے بعد، انہوں نے "دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جسے اہل علم ونظر کے حلقوں میں پسند کیا گیا، اس کے علاوہ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی "مکتبہ جامعہ دہلی" کے اہتمام سے شائع ہوا۔ طلبہ جامعہ کے لیے انہوں نے اسلامی وتاریخی مضامین کے وہ مجموعے بھی ترتیب دیے جو مکتبہ جامعہ سے ہی شائع ہوئے۔ عصر جدید اور اسلام سوسائٹی کی طرف سے شائع ہونے والی زیر ترتیب کتاب کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ خدا کرے وہ مکمل طور پر مرتب ہو چکی ہو۔

ان کے علاوہ ان کی ایک کتاب بقامت کہتر وبقیمت بہتر "عربی زبان کے دس سبق" بھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قواعد عربی میں سے دس اہم اور بنیادی قواعد سہل اور دلچسپ انداز میں سمجھا کر مشقوں میں ان کا اجراء کرایا ہے۔ یہ کتاب عربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قیام کے مختصر زمانہ میں انہوں نے "سیرۃ النبیؐ" کے ابتدائی حصوں کی تلخیص بھی کی ہے۔

سلاست، سہولت، جامعیت، افادیت اور اختصار ان سب کتابوں کا مشترک وصف ہے۔

مولانا کا علم وفضل اور ان کی قدرت تحریر اس سے زیادہ کی متقاضی تھی مگر طلبہ کے مسائل سے عملی دلچسپی، ان کی خدمت وتربیت، اور اپنے اور بیگانے ہر ضرورتمند کی ضرورت کی تکمیل میں مصروفیت، ان کو اس سے زیادہ کا موقعہ نہ دے سکی۔

مولانا کی عادت تھی کہ وہ ہر شخص سے اس کے مذاق کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ مجھ سے گفتگو میں

اکثر وہ اکابر دیوبند کے فضائل و مکارم کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا میاں اصغر حسین رحمہما اللہ سے زیادہ مستفید و متاثر ہوئے تھے۔ اس عقیدت کی بنیاد ان دونوں بزرگوں کی تصنیفات تھیں جن کا مولانا نے شوق اور غور اور دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔

اس سلسلہ میں وہ اپنے دیوبند کے اس سفر کا تذکرہ جو انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے ساتھ، ان کے نگراں اور رہنما کی حیثیت سے کیا تھا، بھی کیا کرتے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ دار العلوم دیوبند میں ان کے اور طلبہ ندوہ کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی جلسہ ہوا تھا۔ ان کو تخت پر بٹھایا گیا اور اکابر دار العلوم ان کے ساتھ بیٹھے دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوہ اور دیوبند کے اکابر کے تعلقات کا تذکرہ فرمایا اور ندوۃ العلماء کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ جواباً انہوں نے بھی علماء دیوبند سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا۔

اپنی مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء سے انہیں قلبی و ذہنی ارتباط تھا اپنی تعلیم اور پھر اپنی تدریس کے زمانہ کا وہ بڑے جذباتی انداز میں ذکر کیا کرتے تھے۔ جو عمر کا حصہ وہاں گزرا اسے "حاصل زندگانی" سمجھتے تھے۔ جامعہ آنے کے بعد بھی اس کے تعلیمی و انتظامی مسائل سے ان کو گہری دلچسپی رہی۔ وہ ندوہ کو مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کی آرزوؤں اور تمناؤں کا پیکر اور ان کے حسین خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے اور اپنی خصوصیات میں اسے ہندوستان کے دوسرے قدیم و عظیم مدارس سے ممتاز دیکھنا چاہتے تھے مخلصی مولانا ابوالحسن علی میاں کا ذکر محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرتے ان کے زمانہ میں ندوہ نے جو صوری و معنوی ترقی کی ہے اور اسے عالم اسلام کا مطمح انظار بنا دیا ہے اس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "اب تو ندوہ اور مولانا علی میاں لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔" ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے تو وہ رکن عرصۂ دراز سے ہی تھے۔ جامعہ سے ریٹائر ہونے کے بعد، ندوہ سے اسی گہرے تعلق کی بناء پر ان کو بالاتفاق دار العلوم ندوۃ العلماء کا "معتمد تعلیمات" منتخب کیا گیا۔ یہ منصب ندوہ میں دار العلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات کے منصب کے مماثل ہے۔ کسی زمانہ میں علامہ سید سلیمان ندوی اس منصب کی زینت تھے، پھر جب ندوۃ العلماء کے علمی و تصنیفی ادارہ دار المصنفین میں، مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم کی یکایک وفات پر ناظم دار المصنفین کی مسند خالی ہوئی تو ارباب ندوہ کی نظر ان ہی پر پڑی اور ان کو اس منصب پر بھی فائز کیا گیا اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے ساتھ

دار المصنفین کے شہرۂ آفاق ترجمان "معارف" کا مدیر بھی بنایا گیا۔ یہ سہ گانہ ذمہ داریاں وہ بڑی مستعدی اور شوق سے زندگی کے آخری لمحات تک ادا کرتے رہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ان کی مادر علمی تھا۔ اس سے بھی ان کو محبت اور قلبی تعلق تھا۔ مولانا کے ریٹائرمنٹ پر انکو الوداعی پارٹی دی گئی تو اس میں الوداعی تقریر کرتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر ہو گئی اور پھر جب وہ میرے ساتھ کمرہ سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔

مولانا کا ایک اہم کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی عمارتوں میں ایک حسین و شاندار مسجد کا اضافہ ہے۔ جامعہ میں ماضی قریب تک کوئی مسجد موجود نہ تھی۔ جمعہ کی نماز بھی مدرسہ ابتدائی کے ایک بڑے کمرہ میں ہوتی تھی جسے "محمد علی ہال" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جامعہ کے دین دار حلقوں میں اس کا شدید احساس تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہوتے ہوئے بھی اسلامیت کی امتیازی علامت سے محروم ہے۔ مولانا اور ان کے ساتھ جناب ڈاکٹر سعید انصاری اور یہ خاکسار، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے) اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے اس سلسلہ میں بار بار ملے، آخر یہ جد و جہد کامیاب ہوئی اور اب الحمد للہ، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے مقبرہ اور جامعہ لائبریری کی شاندار عمارتوں کے جھرمٹ میں ایک حسین و جمیل مسجد کے بلند و بالا مینار یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے۔ اس مسجد کا نقشہ عالم اسلام کے مشہور ماہر تعمیرات محمد فیاض الدین صاحب حیدر آبادی کے موئے قلم کا شاہکار ہے اور دہلی کی عالیشان مسجدوں میں یہ مسجد ایک قابل دید اضافہ ہے۔

مولانا کی زندگی قلندرانہ گزری۔ جامعہ کے آخری دور میں اگرچہ تنخواہ معقول ملتی تھی، مگر اپنی ذات پر کم ہی صرف کرتے تھے۔ ماشاء اللہ اولاد خاصی تھی اور سب کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ طلبہ اور دوسرے ضرورتمندوں کی خاموش دستگیری کرتے تھے۔ ان کے مردانہ کے مختصر کمرہ میں کوئی نہ کوئی طالب علم بھی مقیم رہتا تھا بلکہ اپنے تعلق رکھنے والے ضرورتمندوں کو بعض اوقات گھر کے ایک حصہ میں جگہ دیدیتے تھے۔

مولانا ۴۸ء میں، خواجہ عبد الحی صاحب مرحوم کے ترک ہندوستان کرنے کے بعد جامعہ آگئے تھے۔ اس زمانہ میں جامعہ نگر میں ہو کا عالم تھا۔ چاروں طرف میدان کے میدان خالی پڑے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے اس زمانہ میں آٹھ آنے گز پر زمینوں کے سودے کر کے شاندار اور وسیع کوٹھیاں تعمیر کر لیں، مگر مولانا نے جامعہ میں جامعہ ہی کے ایک پرانے مکان میں زندگی گزار دی اور ریٹائرمنٹ کے بعد، بستر باندھ کر اپنے وطن

تھولینڈی (ضلع رائے بریلی) کا راستہ لیا۔

مولانا کی وفات بھی قابلِ رشک طریقہ پر ہوئی۔ رمضان المبارک کے آخری دنوں میں، عید منانے اعظم گڑھ سے اپنے وطن تشریف لائے۔ ۳۰ رمضان المبارک کی شب کو سحری کے وقت اٹھے، گھر والوں کو سحری کے لئے جگایا، تہجد کی نماز کے لئے وضو کیا تو کمزوری محسوس کی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ صبح ہوتے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور جمعۃ الوداع کی اذان کے وقت اپنے مولائے کریم کے دربار میں حاضری دی۔

اگلے روز عید تھی۔ عیدگاہ میں ہزاروں غم گساروں نے اس محبوب مقتدا کی نماز جنازہ ادا کی، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے جم غفیر نے، سوگوار چہروں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ وانا بفراقہ لمحزونون۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً شاملۃً کاملۃً۔

دعوت اتحاد و تعاون

.... یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بے قرار نہ ہو۔ ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے۔ دین و ملت کے خدمت گذار کسی جگہ جمع ہوں، جزئی اور فروعی اختلافات نظر انداز کر کے مستقبل کی فکر کریں اور آنے والے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

"میرے مولانا"

"میرے مولانا" کی ترکیب اصولی قواعد کی رو سے بھلے ہی غلط ہو لیکن اس میں جو اپنائیت ہے وہ قواعد کے اعتبار سے صحیح لفظ "مولانا" میں کہاں!

ڈاکٹر شبیر الحق (پروفیسر مطالعۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

اسی رمضان (۱۳۹۹ھ) کی ۳۰ تاریخ تھی اور جمعۃ الوداع کا مبارک دن۔ عیسوی کلنڈر کے حساب سے ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء۔ کہ دارالمصنفین کے ناظم علمی اور مدیر معارف، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد اسلامیات اور ناظم دینیات، میرے محترم استاد مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے اپنے وطن مالوف تھولینڈی (ضلع رائے بریلی) میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی کہ اس کی دی ہوئی تھی، دوسرے دن دوگانۂ عید کے بعد ملک کے مشہور عالم اور مولانا کے عمر بھر کے ساتھی، استاد محترم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے گاؤں کے ہزاروں ہندو اور مسلمان ان کے جسد خاکی کو خود انھیں کے اپنے لگائے ہوئے آموں کے باغ کے ایک کونے میں سپرد خاک کر آئے۔ بیماری اور موت سب کچھ اتنی چٹ پٹ ہوئی کہ جب تک لوگ ان تک آتے آتے وہ سب سے منہ موڑ کر جا چکے تھے، اپنے رب سے ملنے کے لئے۔

مولانا سے میرا تعلق دسمبر ۱۹۴۵ء یا جنوری ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا جو پورے تسلسل کے ساتھ ان کی وفات تک باقی رہا، ۳۳ برس کی مسلسل رفاقت کوئی معمولی رفاقت نہیں ہوتی، خصوصاً جب تعلقات اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے مختلف نہج کے ہوں، اس پوری مدت میں ان کا اور میرا تعلق افسر و ماتحت کا بھی رہا ہے اور استاد و شاگرد کا بھی۔ باپ اور بیٹے کا بھی، اور شاید لوگ اسے

چھوٹا منہ اور بڑی بات سمجھیں لیکن بے تکلف دوست اور رازدارِ رفیق کا بھی۔ اس طویل مدت میں مولانا کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے اور اگر یہ دعویٰ کروں کہ اتنے قریب سے دیکھا ہے جہاں درمیان میں کوئی کا پردہ نہیں رہ جاتا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کسی شخص سے بہت زیادہ قربت مفید بھی ہوتی ہے اور مضر بھی۔ سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ زبردستی کا اوڑھا ہوا لبادہ نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور انسان کی اصل شخصیت عریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے، مولانا کے جسم پر بھی ایسا کوئی لبادہ نہیں رہ گیا تھا لیکن خدا گواہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا، وہ گھر بازار، درجہ دفتر، دارالعلوم یونیورسٹی ہر جگہ یکساں تھے۔

میرے مولانا ایک بڑے عالم اور ایک بہت ہی پیارے انسان تھے، ان کی ذات میں علم اور انسانیت دونوں ہی کچھ اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ انھیں الگ الگ کرنا ممکن نہ تھا، اپنے دوسرے بہت سارے ہم عصر علماء کے برخلاف مولانا نے صرف روایتی معنوں میں دینی اور مذہبی ماحول میں زندگی بسر نہیں کی تھی، بلکہ دینی کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی ماحول میں بھی رہے، لیکن کنول کے پھول مولانا کو فخر کرنے کا پورا موقع حاصل تھا کہ وہ ہندوستان کی دو مشہور دینی اور دنیاوی درس گاہوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طالب علم بھی رہ چکے تھے اور استاد بھی۔ اس کے علاوہ وہ جامعہ کے ناظم دینیات بھی تھے اور ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی۔ پھر آخر آخر میں جب دارالمصنفین کو ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تو انھوں نے خرابی صحت کے باوجود وہاں کی نظامت علمی کا بار بھی اٹھا لیا، لیکن جو کام صرف ان کا اپنا اکیلا کہا جائے گا وہ ادارۂ تعلیماتِ اسلام لکھنؤ کا قیام تھا، انھیں اس بات کی بہت فکر رہتی تھی کہ پڑھے لکھے، کام دھندے کے لگے ہوئے لوگوں کو کم سے کم وقت میں اتنی عربی کسی نہ کسی طرح ضرور سکھا دی جائے کہ وہ اس کے سہارے قرآن شریف کو خود سے سمجھ کر پڑھ سکیں، اس کے لئے انھوں نے عربی زبان کے دس ضروری اور بنیادی اسباق مرتب کئے جن کو ختم کر لینے کے بعد بالغ تعلیم یافتہ طالب علم قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کی ابتدا کر دیتا تھا۔ جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت تدریس سے الگ ہوئے تو مئی ۱۹۴۳ء میں انھوں نے لکھنؤ کے مرکزی علاقہ امین آباد میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ادارہ تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی، یہ ادارہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ کی علمی اور دینی زندگی کا مرکز بن گیا، لکھنؤ سے باہر کے طالب علموں کو خط و کتابت

کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی ہر جمعہ اور سنیچر کو بعد نماز مغرب درس قرآن اور درس حدیث ہوا کرتا تھا۔ درس قرآن کی ذمہ داری مولانا علی میاں کے سر تھی اور درس حدیث میرے مولانا دیا کرتے تھے، عربی زبان کی تعلیم کے علاوہ مولانا کم تعلیم یافتہ اردو دانوں کے لیے سیرت و تاریخ کے موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے شروع کیے۔ آج تو بازار میں اس قسم کے کتابچوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن جس وقت مولانا نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا اس وقت یہ ایک بالکل بنجر میدان تھا۔ شروع شروع میں ادارہ کی مالیات کی ذمہ داری اٹھانے والے لکھنؤ کے چند اہل دل مسلمان سرکاری ملازمین تھے جن میں سرفہرست سید اصغر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری محکمہ انہار (یوپی) اور شیخ ظہور الحسن صاحب مرحوم (محکمہ مال) تھے۔ ہاں ادارہ کے ایک اور پرجوش مبلغ انشاء اللہ خاں صاحب بھی تھے۔ یہ یوپی سکریٹریٹ میں غالباً سپرنٹنڈنٹ تھے اور دینی ذوق کی وجہ سے صغیر صاحب اور ظہور صاحب کے حلقہ احباب میں آگئے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ ادارہ نے "دس دن میں عربی سیکھئے" کے عنوان سے جو چھوٹے چھوٹے اشتہارات شائع کئے تھے انھیں اپنی چھتری پر چپکا کر بلا تکلف بازاروں میں گھومتے تھے۔ اس طرح یہ ادارہ کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر رہ گئے تھے۔

ادارہ ابھی اچھی طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ادارہ اور اسکے ہمدردوں کی بساط پلٹ گئی۔ اب تو وہ زمانہ تاریخ کا ایک ورق بن کر رہ گیا ہے لیکن اس تاریخ کے عینی شاہد ابھی باقی ہیں۔ وہ ایک ایسا افراتفری کا دور تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ کی خبر نہیں ہوتی تھی ہندوستانی مسلمانوں کا پورا جسم ایک طرح سے پیر بن کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ اس وقت ادارہ سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کا پہلا شمارہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو "تعمیر" کے نام سے مولانا اور ان کے رفیق کار مولانا علی میاں کی ادارت اور میرے اہتمام میں نکلا۔ تعمیر کا اس وقت صرف یہی ایک بنیادی مقصد تھا کہ مسلمان اپنے دلوں سے ہر قسم کے خوف اور اندیشے کو نکال دیں اور ہجرت کے بہانے اس ملک سے نہ بھاگیں، یہیں جمے رہیں اور ثبات قدمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ تعمیر میں لکھنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا، یہ نہیں کہ لکھنے والوں کی کمی تھی بلکہ اس لیے کہ ایک خاص لگن سے لکھنے والے کم تھے اور جو تھے وہ پابہ رکاب تھے، اس لئے زیادہ تر مضامین اہل ادارہ ہی کے ہوتے تھے۔ اگرچہ

تعمیر کی ادارت دو عالموں کے سر تھی لیکن پہلے ہی شمارہ سے اس بات کا اہتمام رکھا گیا تھا کہ سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ کہانیوں اور ڈراموں کے انداز میں ہلکی پھلکی چیزیں اور کچھ نظمیں اور غزلیں بھی ضرور ہوا کریں۔ "ادب لطیف" لکھنے کی ذمہ داری تو مولانا نے میرے سر ڈالی۔ مجھے اس میں فن اور دلچسپی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ صفحات اور کبھی کبھی سطروں کی گنتی کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اکثر "جائے تنگ" والی بات آپڑتی تھی۔ نظموں اور غزلوں کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ وہ بن مانگے بھی مل سکتی تھیں لیکن دشواری انتخاب کی تھی۔ شعرا اپنے ہر شعر کو حاصل کلام جانتے تھے اور مولانا مقراض ادارت کے بے دھڑک استعمال کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس طرح بہت سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ شروع میں اس کا حل یہ نکالا گیا کہ غیر مطبوعہ کلام کے بجائے زندہ اور مردہ شاعروں کے مجموعوں میں سے "حسب منشا" اشعار نکال کر ان پر اپنی طرف سے حسب حال سرخی جما کر انھیں شائع کیا جاتا تھا۔ اس طرح جب وہ غزلیں اور نظمیں تعمیر میں شائع ہوتی تھیں تو پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ میر و مرزا اور جوش و فیض نے یہ چیز "خاص برائے تعمیر" لکھی تھی۔ ادارہ کی مالی حالت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ رہی سہی کسر تعمیر نے پوری کر دی۔ عوامی چندہ تو ادارہ کو کبھی ملا نہیں، دو ایک ہمدرد جو اپنی جیب سے کچھ دیا کرتے تھے وہ یا تو پاکستان جا چکے تھے یا جو رہ گئے تھے وہ گاڑی کو گھسیٹتے گھسیٹتے تھک چکے تھے۔ کتابوں کی فروخت ــــ واضح رہے کہ آمدنی نہیں ــــ صرف فروخت سے دن و رات کٹ رہے تھے۔ تعمیر کا خرچ خریداروں کے چندہ کی آمدنی سے زیادہ تھا۔ ۵۰-۱۹۵۱ء تک پہونچتے پہونچتے ادارہ پر پوری طرح سے پیغمبری وقت پڑ چکا تھا۔ کارکنوں کی تنخواہیں باقی رہ جاتی تھیں کیونکہ قومی اداروں کی سب سے کمزور مخلوق یہی ہوتی ہے۔ کاغذی، کاتب، پریس مین، مالک مکان، کسی کا بل کوئی ادارہ نہیں روک سکتا۔ قربانی کی چھری جب گرتی ہے تو بے چارے کارکنوں کی گردنوں پر، لیکن خون کے چھینٹے کسی کو نظر نہیں آتے۔ بہر حال حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور ادارہ کو بند کر دینے کی بات دلوں سے نکل کر زبانوں پر آنے لگی۔

مولانا کے ندوہ اور جامعہ کے دور طالب علمی کے ساتھی اور بہت ہی گہرے دوست رئیس احمد جعفری مرحوم تقسیم کے بعد پاکستان جا چکے تھے۔ انہوں نے اور مولانا نے جامعہ کے بعد روزنامہ خلافت بمبئی سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مولانا تو دو ہی ایک برس میں وادی صحافت سے نکل کر ندوہ میں استاذ کی

حیثیت سے آ گئے لیکن جعفری صاحب کو یہ میدان ایسا بھایا کہ وہ اس سے باہر نہ نکل سکے۔ تمام عمر ان کی یہ خواہش رہی کہ مولانا بھی کسی طرح ان کے پاس پہونچ جائیں۔ ۱۹۴۳ء میں جب مولانا ندوہ سے علیحدہ ہوئے تھے تو جعفری صاحب یہ چاہتے تھے کہ مولانا ان کے پاس بمبئی چلے جائیں لیکن مولانا ادارہ کی دوکان لگا کر لکھنؤ ہی میں بیٹھ رہے۔ تقسیم کے بعد جب ادارہ کی مالی حالت قابو سے باہر ہوتی گئی تو رئیس صاحب نے اصرار کرنا شروع کیا کہ مولانا کراچی چلے آئیں۔ ادارہ کے حالات جب بالکل ہی غیر یقینی ہو گئے تو مولانا بھی ترک وطن کی بات سوچنے لگے اگر مولانا سفر سے گھبراتے نہ ہوتے تو شاید یہ حادثہ ہو بھی جاتا لیکن اپیا (اہلیہ مولانا) اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر کراچی کی طرف ہجرت کرنا مولانا کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر اس وقت کوئی ایسی صورت نکل آئی ہوتی کہ اپیا اور بچے کسی کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہوتے تو مولانا بھی اس "عذر" پر پاکستان چلے جاتے کہ بیوی بچوں کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ ان دنوں وہ پاکستان جانے کے سلسلے میں اتنے سنجیدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے کسی فیصلہ پر پہونچنے کے لیے صلوٰۃ استخارہ پڑھنی شروع کر دی کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ جب مولانا کو کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو وہ استخارہ کی نماز پڑھتے اور خواب میں اشارہ کے منتظر رہتے۔ بہر حال سفر پاکستان کے سلسلے میں انہوں نے جو خواب دیکھا اور اس کی جو تعبیریں دی گئیں وہ خود اپنی جگہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے۔ ایک رات مولانا نے خواب میں اپنے کو کراچی کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز کے وقت دیکھا۔ مسجد اپنی ظاہری شکل و صورت سے مملکت اسلامیہ کے دار السلطنت کے اگرچہ شایانِ شان نہیں تھی لیکن لوگوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ مگر لوگ نماز پڑھنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے زور زور سے آپس میں کچھ بحث کر رہے تھے۔ کچھ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر مسجد میں لیٹے ہوئے تھے۔ مولانا کو بمشکل آخری صف میں جگہ ملی۔ منبر کی طرف انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک شخص ننگے سر، گھٹنوں سے اوپر تک نیکر پہنے ہوئے خطبہ دیتا ہوا نظر آیا لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ شور و غل کی وجہ سے سنائی نہیں پڑ رہا تھا۔ مولانا نے منبر تک پہونچنے کی کوشش کی لیکن بھیڑ کی وجہ سے پہونچ نہیں پائے اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ صبح جب انہوں نے یہ خواب سنایا تو ان لوگوں نے جو مولانا کے پاکستان چلے جانے کے حق میں تھے، اس خواب کو پاکستان جانے کی تائید میں سمجھا۔ انہوں نے اس کی تعبیر یہ نکالی کہ پاکستان کا دینی ماحول بگڑتا جا رہا ہے اس لیے اشارۃً یہ بتایا گیا ہے

کہ اچھے لوگوں کو وہاں پہونچ کر اصلاح حال کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس خواب کا ذکر مولانا نے جب مولانا محمد منظور نعمانی سے کیا جو اس وقت بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ آگئے تھے تو انہوں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ مولانا کو پاکستان جانے کے ارادہ سے روکا جا رہا ہے۔ مولانا اپنے خواب میں مسجد کی آخری صفوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مولانا کو پاکستان میں کام کے مواقع حاصل نہیں ہونگے مولانا چونکہ خود بھی سفر کرنے کے لیئے تیار نہیں تھے اس لئے مولانا محمد منظور نعمانی کی تعبیر ان کے دل کو زیادہ بھائی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جامعہ میں ان کی ملازمت کے حالات پیدا ہو گئے۔ ناظم دینیات اور استاذ اسلامیات (جامعہ کالج) کے عہدوں کی جامعہ کی طرف سے انہیں پیش کش ہوئی جسے کچھ تھوڑے سے تامل کے بعد انہوں نے قبول کر لیا، اور ۱۷ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ چلے آئے۔ ان کے جامعہ چلے آنے کے بعد ان کے دوسرے سینیئر رفیق مولانا عبد الغفار ندوی بھی کل وقتی طور پر جماعت اسلامی کی خدمت میں لگ گئے اور ادارہ میں صرف میں اور احتشام صاحب (احتشام علی ندوی رحیم آبادی) رہ گئے۔

مولانا کے جامعہ چلے جانے کے بعد تقریباً دو برسوں تک کسی نہ کسی طور سے تعمیر نکلتا رہا۔ اب ادارۂ تحریر میں میرا نام بھی شامل کر لیا گیا تھا، کیونکہ مولانا دہلی میں رہتے تھے اور مولانا علی میاں اپنا زیادہ تر وقت تبلیغی جماعت اور ندوہ کو دیتے تھے۔ بہر حال کچھ دنوں تک لشٹم پشٹم تعمیر نکلتا رہا۔ آخر کار ۱۹۵۳ء میں رسالہ نے آخری ہچکی لے لی۔ مولانا کے جامعہ چلے جانے کے بعد میں ایک شبینہ اسکول میں سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس اسکول کے ذریعہ میں نے ۱۹۵۲ء میں یوپی بورڈ کا ہائی اسکول اور ۱۹۵۴ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ لکھنؤ میں پرائیوٹ طور سے بی۔ اے کرنے کی سہولت نہ تھی۔ ان امتحانات کے دوران مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا تھا کہ میں ریاضی کا اچھا طالب علم ہوں۔ اس وجہ سے میں انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینیرنگ کی لائن میں جانا چاہتا تھا۔ لکھنؤ کے ہیوٹ انجینیرنگ کالج میں داخلہ منظور بھی ہو گیا تھا لیکن مالی ذرائع لکھنؤ میں ایسے میسّر نہ تھے کہ اپنے گھر والوں کے اخراجات کے ساتھ اپنے تعلیمی اخراجات بھی پورے کر سکتا۔ اس لئے میں نے مزید تعلیم کا خیال چھوڑ کر لکھنؤ ہی میں ملازمت کے لئے کوششیں شروع کیں۔ مولانا نے اس سے اختلاف کیا اور مجھے جامعہ میں داخلہ لے لینے کی رائے دی۔ مولانا کا کہنا یہ تھا کہ جب تک میں نے ہائی اسکول اور ایف۔ اے کے امتحانات نہیں پاس کئے تھے اس وقت تک میں اپنی ندوہ کی تعلیم کی بنیاد

پر پڑھے لکھوں کی محفل میں پڑھا لکھا شمار کیا جا سکتا تھا لیکن اب تعلیم کا رُخ بدل دینے کے بعد اگر میں نے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی تو میں کسی طرف کا نہ رہوں گا۔ میری اتنی عمر ہونے کو آئی لیکن یہ فلسفہ میں نے صرف مولانا کی زبان سے سنا کہ آدمی کو اپنی پسند کی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے لیکن وہ جس لائن کو بھی اختیار کرے اس لائن کی اعلیٰ ڈگری اس کے پاس ہونی چاہیئے۔ اعلیٰ ڈگری حاصل کر لینے کے بعد یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ملازمت بھی اعلیٰ مل جائے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا جب بھی کم از کم دنیا اس کے ساتھ ہمدردی تو کرے گی اور زمانے کی ناقدری کو روئے گی لیکن اگر اعلیٰ ڈگری نہ ہو تو بے کاری کے ساتھ پڑوسیوں کے طعنے بھی سننے کو ملیں گے کہ اپنے کو اچھی ملازمت کے قابل تو بنایا نہیں اب نہ ملنے کو کس منہ سے گالیاں دیتے ہو۔ بہر حال قصّہ مختصر میں ۱۹۵۴ء میں جامعہ آگیا۔ اور بی۔ اے کے پہلے سال میں مجھے داخلہ مل گیا۔ بورڈنگ کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ تھا اس لئے مولانا نے اپنے ساتھ ہی مجھے رکھا۔ جامعہ کی طرف سے فیس تعلیمی معاف کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کی سعی و سفارش سے میں جامعہ کے مختلف شعبوں اور دفتروں میں مختلف اوقات میں کام کر کے اتنا حاصل کر لیتا تھا کہ اپنی اور گھر والوں کی ضروریات کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لوں۔ جامعہ میں اس وقت یہ عام رواج تھا کہ لوگ جامعہ کے مطبخ سے ایک متعین رقم کے عوض کھانا جاری کرا لیا کرتے تھے۔ گھروں گھر اسی طرح کھانا جایا کرتا تھا۔ اپیا ان دنوں زیادہ تر تھولینڈی میں رہا کرتی تھیں، کچھ اس لئے بھی مولانا کے یہاں حسب ضرورت کھانا مطبخ سے آتا تھا۔ کبھی کبھی دسترخوان پر اضافہ یا تبدیلی کی خاطر گھر میں بھی کچھ پک جایا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے دو سال مولانا کے گھر پر گذارے لیکن کسی ایک دن بھی مجھے ناشتہ دان لے کر مطبخ نہیں جانا پڑا۔ یہ ڈیوٹی مولانا کے لڑکوں کے سر تھی۔ ان میں آپس میں کبھی کبھی باری کے تعین پر اختلاف بھی ہو جاتا تھا لیکن یہ مسئلہ کبھی نہیں اٹھا کہ میری باری کیوں نہیں لگتی۔ ایک دو دن اس قسم کا انتظام چل سکتا ہے لیکن پورے دو سال تک اسے نبھا لیجانا آسان نہ تھا۔ جس زمانے میں اپیا نہ ہوتیں کھانے کے بعد ہر شخص کو اپنی اپنی پلیٹیں خود دھونی پڑتی تھیں، اس میں نہ مولانا کی تخصیص تھی اور نہ میری۔ اس سلسلے میں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ جب میں جامعہ آیا تو مولانا نے یہ طے کیا کہ میں ہر ماہ انھیں ایک معمولی سی متعینہ رقم دیدیا کروں اور اس کے بعد کھانے، ناشتے، دھوبی کی دھلائی وغیرہ کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔

یہ رقم مطبخ کی ماہوار فیس سے کچھ کم ہی تھی۔ جب میں تعلیم سے فارغ ہو کر جامعہ ہی میں کام سے لگ گیا تو ایک دن مولانا نے مجھ سے خود ہی کہا کہ میں تم سے ہر ماہ جو رقم لیا کرتا تھا اس سے تمہیں تکلیف ضرور ہوتی رہی ہوگی اور تم سوچتے رہے ہوگے کہ میں تمہیں کام دلانے کے لئے دفتروں میں مارا مارا پھرتا ہوں لیکن اپنی طرف سے اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ تم سے کھانے کے دام نہ لوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کبھی ایسی بات سوچی ضرور تھی لیکن اب جب وقت گذر چکا تھا تو مولانا سے کیا کہتا۔ میں نے ان کے جواب میں کہا تو یہ کہا کہ نہیں نہیں مولانا، آپ یہ کیا کہہ رہے۔ مجھے تو اس کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ رقم ہی کون سی زیادہ تھی۔ اتنے میں تو مجھے مطبخ سے دو وقت کا کھانا بھی نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن مولانا نے کہا، خیر یہ بات تو تم سعادت مندی میں کہہ رہے ہو، تمہیں خیال ضرور آیا ہوگا۔ خود میری بیوی نے اکثر مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ تم مشیر سے ہر ماہ روپے کیوں لیتے ہو؟ خواہ مخواہ کا نام ہوتا ہے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر باقاعدہ حساب کر کے پورے پیسے لو۔ لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وقت گذر جائے گا، آگے چل کر کسی کو کیا، خود تم کو بھی یہ یاد نہیں رہے گا کہ کتنے روپے تم دیتے تھے ـــــ اور یہ واقعہ ہے کہ اب مجھے بالکل صحیح صحیح رقم یاد نہیں ہے ـــــ صرف اتنی بات لوگوں کو یاد رہ جائے گی کہ تم میرے گھر اپنے خرچ پر رہتے تھے۔ اس طرح میرے اعزہ واقربا تمہیں کبھی طعنہ نہ دے سکیں گے کہ تم ان کے کسی عزیز کی روٹیوں پر پلے ہو۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں کی نظریں بھی میرے گھر والوں کے آگے نیچی نہیں ہوں گی ـــــ نیکی کر کے دریا میں ڈالنے والے تو آج بھی مل جائیں گے لیکن مولانا کے ایسے کتنے لوگ ملیں گے جو اس فکر میں لگے رہتے ہوں کہ ان کی طرف ان کی اپنی نیکیوں کی بھی نسبت نہ ہونے پائے۔

جس زمانہ میں مولانا جامعہ کے ناظم دینیات تھے اس وقت جامعہ کے دستور کی رو سے یونی ورسٹی کی دینی زندگی میں ناظمِ دینیات بہت اہم حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ وہ مختلف مجالس اعلیٰ کا اپنے عہدہ کے اعتبار سے ممبر ہوتا تھا، لیکن سب کچھ جامعہ کی "دستوری کتاب" کی رو سے تھا ورنہ عملاً اس کی حیثیت دور وسطیٰ کے مضبوط، خود مختار مسلمان بادشاہوں کے شیخ الاسلام سے زیادہ نہیں تھی۔ جامعہ میں مولانا کے کچھ پرانے ساتھی اپنی نجی صحبتوں میں جامعہ کی دینی زندگی میں انحطاط کا رونا رویا کرتے تھے۔ یہ لوگ خود ارباب حل وعقد میں شمار ہوتے تھے لیکن خود سامنے آنے کے بجائے مولانا کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے اکسایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ کے

امراء اور صوبے دار علم بغاوت تو بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن عواقب کے ڈر سے شیخ الاسلام کے کندھے کو استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن مولانا دوسروں کو بندوق ٹکانے کے لئے اپنا کندھا پیش کرنے پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ میں اگرچہ جامعہ کے "بڑوں" کی محفلوں میں بہت خورد یا یونیورسٹی کی زبان میں بہت جونیر تھا لیکن مولانا کے ساتھ ہمہ وقت رہنے کی وجہ سے اونچی بارگاہوں میں رسائی تھی، اور میری موجودگی میں لوگ بلا تکلف ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جن کا سننا عام حالات میں میرے لئے ممکن نہ تھا۔ جامعہ آنے سے قبل لکھنؤ میں مولانا نے پاکستان کی نسبت سے جو خواب دیکھا تھا وہ اب محسوس ہو رہا تھا کہ شاید جامعہ سے متعلق تھا۔ ایک بار جب اس خواب کا تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے مولانا سے کہا بھی کہ آپ کا استخارہ کس قسم کا تھا کہ آپ نے دیکھا تو پاکستان کے سلسلے میں تھا اور وہ نکلا جامعہ کے بارے میں۔

اختلاف وانتشار سے دامن بچائے رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مولانا جامعہ کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ مولانا حق بات کہنے سے بچتے رہے ہوں۔ اس کے برعکس وہ ہر موقع پر حق کا اظہار ضروری سمجھتے تھے لیکن اظہار کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا حق اپنی کڑواہٹ کھو چکا ہوتا تھا۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ اول وہ بالالتزام اردو میں دیا کرتے تھے، بہت ہی مختصر اور بے لاگ۔ ان خطبوں میں جامعہ کی "سیاست" پر تنقید ہوتی تھی، ملک کے حالات پر تبصرہ ہوتا تھا، اخلاقی سدھار کی طرف اشارات ہوتے تھے غرضیکہ سب ہی کچھ ہوتا تھا لیکن تنقید کا رُخ کبھی ذاتی نہیں ہوتا تھا۔ تقریر میں کسی کی تنقیص نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ اس ہفتے مولانا نے کسے اپنا نشانہ بنایا۔

ناظم دینیات ہونے کے ناطے مولانا کے پاس ضرورت مند لوگ فتوی حاصل کرنے کے لئے بھی آیا کرتے تھے، لیکن مولانا نے شاید کبھی کسی فتوے پر دستخط کئے ہوں۔ عام طور سے وہ یہ کہہ دیتے تھے کہ دیوبند یا دہلی کے کسی عالم سے فتویٰ حاصل کر لیجئے۔ اگر کوئی صاحب مولانا ہی کے فتوے پر اصرار کرتے تو مولانا یہ جواب دیتے کہ اگر مجھے یہ کام کرنا ہوتا تو اس اس طرح کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک عیدالاضحیٰ کے موقع پر جامعہ کے ایک راج مستری محمد جمیل صاحب مولانا کے پاس آئے اور بولے کہ انہوں نے بکری کا ایک بچہ قربانی کی نیت سے پالا تھا وہ کھاپی کر خوب تگڑا ہو گیا ہے لیکن اب حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ قربانی کی متعینہ عمر سے کچھ کم ہے، تو کیا اس کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ مولانا نے مستری صاحب کو ان صحابی کا قصہ سنایا جنھوں نے اسی قسم کا سوال اپنے بھیڑ

کے بچے کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا اور آپؐ نے انہیں قربانی کی اجازت دیدی تھی۔ قصہ سنانے کے بعد مولانا نے مستری صاحب سے کہا کہ آپ کسی عالم سے فتویٰ لیں گے تو وہ یہی کہے گا کہ اس صورت میں قربانی جائز نہیں ہے، لیکن اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو گھر جا کر اس بچے کی قربانی کر دیتا۔ مستری صاحب یہ سُن کر واپس چلے گئے اور انہوں نے اسی سال اسی بچے کی قربانی کی۔ اس کے برعکس جب پڑھے لکھے لوگ فتویٰ لینے کے لئے مولانا کے پاس آتے تو صاف معلوم ہوتا کہ وہ اپنے دل کی کھٹک دور کرنے کے لئے نہیں بلکہ بحرِ اختلاف میں ایک نئی لہر پیدا کرنے کے لئے ایک ڈھیلا پھینکنے کی اجازت لینے آئے ہوں۔ ایک عید کی صبح کا واقعہ مجھے یاد ہے، دہلی میں عید کا چاند نظر نہیں آیا تھا لیکن ریڈیو پر رات ہی سے ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں سے عید کے منائے جانے کی خبریں آ رہی تھیں۔ مولانا نے روزہ توڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے گھر کے سامنے باہری چبوترے پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ اب جو بھی فتویٰ پوچھنے کے لئے آتا تو مولانا اسے چائے کی پیالی دکھا کر کہتے کہ میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔ چھوٹے لوگ تو مزید سوال و جواب کئے بغیر مطمئن ہو کر گھر چلے جاتے تھے لیکن اہل علم آتے تو مولانا کی رائے معلوم کرنے کے لئے لیکن مولانا کے عملی جواب پر بحث کرنے کی کوشش کرتے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں دہلی کے ان علماء کے نام گنواتے جو اس روزہ کے حق میں تھے۔ مولانا بحث کرنے کے بجائے صرف یہی کہتے کہ ٹھیک ہے جب تک آپ کا دل مطمئن نہ ہو جائے اس وقت تک آپ روزہ قطعاً نہ توڑیں۔ چونکہ آپ خود اہل علم ہیں اس لئے آپ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ آپ میرے عمل کو مثال بنائیں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ دہلی کے دوسرے علماء کے فتوے کا انتظار کریں۔ پھر ایسا ہوا کہ شام ہوتے ہوتے دہلی کے علماء نے بھی روزہ توڑنے کا حکم دیدیا۔ جن لوگوں نے مولانا کی پیروی میں صبح ہی کو روزہ توڑ دیا تھا وہ مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ مولانا اسی دن عید کی نماز بھی پڑھا دیں۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ دہلی شہر میں عید کا اعلان نہیں ہوا ہے اس لئے اتحادِ ملت کا تقاضا ہے کہ جامعہ میں بھی عید کی نماز نہ ہو، روزہ کھولنا تو اس لئے ضروری تھا کہ میرے اپنے خیال میں آج کا روزہ مجھ پر حرام ہے لیکن عید کا دوگانہ آج کے بعد کل بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے اصرار کے باوجود مولانا اس تجویز کے کبھی بھی مؤید نہ ہوئے کہ جامع مسجد، فتح پوری مسجد، اور دہلی رویت ہلال کمیٹی کی طرح جامعہ بھی اپنے تئیں رویت ہلال کی شہادتوں کو اکٹھا کرنے کا انتظام کرے اور شہر کے اعلان کا انتظار کئے

بغیر نتیجہ کا اعلان کر دیا کرے۔

مولانا کو جم کر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ ادارہ کے زمانہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت ایک خاص قسم کی نصابی کتابوں کی سی ہے۔ "تعمیر" کے صفحات میں یہ گنجائش نہ تھی کہ اعلیٰ علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہو سکتے۔ ہاں تعمیر میں انہوں نے تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا جو سورۂ بقرہ کے ختم تک پہونچ پایا تھا کہ تعمیر کی اشاعت رُک گئی۔ وفات سے کچھ دن پہلے میرے اصرار پر انہوں نے اس پر نظرِ ثانی کر کے مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لئے دیا تھا، کتابت قریب قریب پوری ہو چکی تھی کہ انکا آخری وقت آ گیا اور اسے کتابی شکل میں دیکھنے کے لئے اس دنیا میں نہ رہے۔ مولانا دراصل لکھنے سے بہت بھاگتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا لکھنے کو ٹالتے رہتے۔ حقیقتاً انہیں گفتگو کرنے میں "مزا" آتا تھا۔ اس لئے جب بالکل ہی سر پر پڑ جاتی تو مضمون املا کرا دیا کرتے۔ ان کے اکثر و بیشتر مضامین املا کرائے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے مضامین صرف وہ ہوں گے جنھیں لکھانے کے لئے کوئی شخص انھیں نہ ملا ہوگا۔ املا کرا دینے کے بعد عبارت کی نوک پلک درست کرنے کے لئے مضمون پر نظرِ ثانی کی عادت نہیں تھی۔ جو بول دیا سو بول دیا، ہاں جن مضامین کے لکھنے والے چھوٹے درجوں کے طالبعلم ہوتے تھے ان پر املا کی غلطیوں کے پیشِ نظر ایک نظر ڈال لیتے تھے۔

اس نہیں نہیں کے باوجود مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اسے ان کی تدریسی اور ادارتی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے کچھ بہت زیادہ کم نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا جب ندوہ میں استاد تھے تو اس کے ساتھ رسالہ "الندوہ" کے شریک مدیر بھی تھے۔ ادارت کا یہ دور تقریباً ۳۔۴ سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ مضامین تو اس میں بھی ان کے ہوں گے۔ پھر ادارہ میں پندرہ روزہ "تعمیر" کی ادارت ان کے سر تھی اور تعمیر کا شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں ان کے قلم سے کوئی چیز شائع نہ ہوئی ہو۔ جامعہ آنے کے بعد رسالہ جامعہ میں ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ پھر ۱۹۶۸ء سے اسلام اور عصرِ جدید کی مجلسِ ادارت کے رکن ہو گئے تھے۔ اور بالکل آخر میں تو معارف کی ادارتی ذمہ داری ان کے سر آ پڑی تھی۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو جتنا وہ لکھنے سے بھاگتے تھے اتنا ہی قدرت انہیں لکھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ رسالوں میں منتشر مضامین کے علاوہ ان کی جو کتابیں اور رسالے علیحدہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے ایک طرف اگر موضوع

کا تنوع ظاہر ہوتا ہے تو دوسری طرف ان موضوعات پر مولانا کی قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بہرحال انکی تصنیفات کی ایک غیر تشریحی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ہماری بادشاہی (تاریخ اسلام) مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (کئی اڈیشن شائع ہو چکے)
۲۔ ہندوستان کی کہانی (تاریخ ہند) " " " (" " ")
۳۔ حدیث نبوی کے اولین صحیفے (حدیث) ادارہ تعلیمات اسلام، لکھنؤ (دو اڈیشن: دستیاب نہیں)
۴۔ عربی زبان کے دس سبق (عربی زبان کی تعلیم کا سلسلہ) " " " (لاتعداد اڈیشن، بیشمار جعلی اڈیشن)
۵۔ قرآن مجید کی پہلی کتاب (" " ") " " " " (کئی اڈیشن)
۶۔ قرآن مجید کی دوسری کتاب (" " ") " " " " (" ")
۷۔ قرآن مجید کی تیسری کتاب (" " ") " " " " (" ")
۸۔ حضرت بلال (سوانح) " " " (دو یا تین اڈیشن: اب دستیاب نہیں)
۹۔ مثالی حکمراں (تاریخی واقعات) " " " (ایک اڈیشن: اب دستیاب نہیں)
۱۰۔ آدرش شاشک (ہندی ترجمہ مثالی حکمراں) ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (غالباً ایک اڈیشن)
۱۱۔ تعلیمات اسلام دو جلدیں (اسلامیات) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (ایک اڈیشن)
۱۲۔ دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد (مجموعہ مضامین: اسلامیات) " " (" ")
۱۳۔ مسلمان اور وقت کے تقاضے (" ") " " (" ")
۱۴۔ تفسیر سورہ بقرہ (مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہونے والی ہے)
۱۵۔ سیرۃ النبیؐ (علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی ۶ جلدوں میں لکھی ہوئی سیرۃ النبیؐ کی ایک جلد میں تلخیص۔ دارالمصنفین سے شائع ہونے والی ہے)۔

مولانا کے یہاں صوفیوں والی وسیع المشربی اور سچے عالموں کی وسعت قلبی تھی۔ وہ کسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اشخاص اور جماعتوں پر تنقید کرنے میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ مولانا نے کبھی کسی جماعت سے اپنا باقاعدہ تعلق نہیں قائم کیا لیکن ان کے اکثر و بیشتر رفقاء کسی نہ کسی جماعت سے پوری طرح منسلک تھے۔ بایں ہمہ ان کے تعلقات ہر شخص سے اس کی ذات کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ ادارہ کی زندگی میں مولانا

کے ساتھ کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف تبلیغی جماعت کے رکن رکین مولانا علی میاں تھے تو دوسری طرف جماعت اسلامی کے سرگرم رکن مولانا عبدالغفار ندوی تھے مگر دونوں مولانا کے چہیتے تھے۔ مولانا کی زندگی میں بہت سارے مسلم قائدین اور جماعتوں پر علماء اظہار رائے کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بات ہوش کی سرحدوں سے نکل کر جوش کے حدود میں داخل ہو جاتی، لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی ایک سطر بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں انہوں نے کسی شخص یا کسی جماعت کو اسلام کے لئے خطرہ محسوس کر کے سب وشتم کا انداز اختیار کیا ہو۔ اگر تمام دنیا کسی شخص کو برا کہتی جب بھی مولانا اکثریت کی رائے سے متاثر ہو کر عوامی دھارے میں نہیں بہہ سکتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب قادیانی مسئلہ کے سلسلہ میں پاکستانی عدالت نے مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی اور ان کے دن گنے جانے لگے تو ہندوستان کے مسلم اخبار و رسائل نے عام طور سے اس فیصلے کے خلاف اداریے لکھے۔ اس فیصلہ پر تعمیر کے لئے میں نے بھی ایک نوٹ تیار کیا تھا۔ میں جماعت سے کبھی بھی منسلک نہیں رہا لیکن غیر جماعتی حیثیت سے لکھنؤ کی زندگی میں بے تکلفی کے تعلقات جماعتی شعراء و ادباء ہی سے تھے۔ ویسے بھی نوجوانی کا زمانہ تھا، خون کی حدت شباب پر تھی۔ اس لئے میرا نوٹ مولانا کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ آتشیں ہو گیا تھا۔ مولانا اس نوٹ کی اشاعت کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ نوٹ کی آتش نوائی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے، کیونکہ یہ چیز تو جس راہ کے وہ مسافر ہیں اس کا تحفہ ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تم مولانا کو بالکل بے قصور اور حکومت پاکستان کو سرتاپا مجرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ تمہارے پاس کوئی ایسا آزاد اور قابل اعتماد ذریعہ ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم یہ کہہ سکو کہ پاکستانی عدالت نے مولانا پر جتنے الزامات لگائے ہیں وہ سب کے سب غلط اور بے بنیاد ہیں۔ "تعمیر" جماعت کا ترجمان نہیں ہے اس لئے صحافتی انصاف کا تقاضا ہے کہ تم جوش میں آکر خود جج نہ بن جاؤ۔ بہرحال مولانا نے اس مضمون پر اس طرح نظر ثانی کی کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اس واقعہ سے متاثر ہو کر کئی روز تک منہ پھلائے گھومتا رہا اور مولانا چھیڑ چھیڑ کر مجھے مناتے رہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، مولانا کا لکھنا مجبوری کا لکھنا تھا۔ جب کسی عذر سے کام نہ چلتا تو مجبوراً لکھتے۔ اس کے برخلاف ان کے رفیق، مولانا علی میاں ایک داعی کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے بجا طور سے

وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں تک پہونچ جائے۔ مولانا علی میاں کا یہ عالم کچھ آج نہیں ہوا ہے، ادارہ کے زمانہ میں بھی وہ اسی جذبہ کے تحت لکھتے تھے۔ اس موجودہ نسل میں کم ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے علی میاں کے رسالہ "ٹنڈن جی سے خطاب" کو پڑھا ہوگا۔ یہ بات ۴۸ء کی ہے۔ ٹنڈن جی غالباً اس وقت صدر کانگریس تھے۔ اب مجھے اس مضمون کی تفصیلات اچھی طرح یاد نہیں ہیں لیکن ہوا یہ تھا کہ ٹنڈن جی نے اپنی ایک تقریر میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھیں جن سے مسلمانوں کے دلوں کو تکلیف پہونچی تھی۔ علی میاں نے اسی تاثر میں یہ اور چند رسائل لکھے تھے۔ اسی دوران جے پور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اس لئے بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ ان رسائل کو جن میں سے اکثر کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی ہوگیا تھا وہاں لے جائیں

دن رات ایک کر کے رسالہ کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو انگریزی ترجمہ غالباً ابرار احمد صاحب نے کیا تھا جو ادارہ کے طالب علم تھے اور یوپی سکریٹریٹ میں کلرک تھے۔ آج کل وہ شاید اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ بہرحال اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں رسالے کو شائع کیا گیا اور اجلاس میں تقسیم کرنے کے لئے ندوہ کے ایک استاد مولانا محمد اسحاق سندیلوی (حال مقیم پاکستان) کے ساتھ میں نے جے پور کا سفر کیا۔ اس واقعہ کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ آپ کو بتا سکوں کہ مولانا علی میاں جب کچھ لکھتے تھے تو اسے من وعن زیادہ سے زیادہ لوگوں تک فوراً پہونچانا ضروری سمجھتے تھے۔ مولانا اس طرز فکر سے متفق نہیں تھے۔

مولانا کی تحریر ان کی شخصیت کی طرح ہر قسم کے تکلفات سے پاک ہوتی تھی۔ ان کے مضامین میں نہ تو لمبی تمہید ہوتی تھی اور نہ مرادفات کی بھرمار۔ وہ اپنی تحریر اور خصوصاً تقریر میں تفصیلات سے اس حد تک احتراز کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو بات صرف اشاروں تک محدود رہ جاتی تھی۔ ان کی تقریر میں اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کوئی واقعہ بطور مثال بیان کرنا شروع کرتے۔ جب قصہ کلائمکس پر ہوتا اور سب لوگ دھیان سے سُن رہے ہوتے کہ اچانک نتیجہ بتا کر قصہ کو یوں ختم کر دیتے گویا کہہ رہے ہوں کہ تفصیلات کا علم تو آپ سب لوگوں کو ہے، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ میں نے ان سے کئی بار اس بات کی شکایت کی کہ آپ واقعات اور مثالوں کو درمیان ہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جواب میں وہ یہی کہتے کہ یہ کون سا اہم واقعہ تھا، سب ہی لوگ جانتے ہونگے یہ بات مولانا کے دل میں کبھی نہ اتر سکی کہ وہ اپنے سامعین کے علم کا کچھ زیادہ ہی اندازہ لگایا کرتے ہیں۔

تحریر میں مرادفات کے استعمال کے سلسلے میں مولانا نے کئی بار یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ جامعہ کے طالبعلمی کے زمانہ میں علماء کی اردو پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان سے ایک بار کہا تھا کہ آپ لوگ مزے میں ہیں ہر ہر جملے کو اس طرح دہراتے اور تہراتے ہیں کہ ضرورت پڑ جائے تو ایک کتاب کو آسانی سے تین کتاب بنا کر شائع کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی تحریر پڑھتے وقت بھی مولانا پر ایک خاص قسم کی عجلت طاری رہتی تھی۔ میں بہت پہلے کی بات تو نہیں جانتا لیکن پچھلے ۳۲، ۳۳ برسوں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا نے قرآن کے علاوہ کسی کتاب کو بھی شروع سے آخر تک حرفاً حرفاً نہ پڑھا ہوگا۔ وہ آنکھوں سے پڑھتے تھے اور پیراگراف کے پیراگراف غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ ناول اور افسانوں کے بارے میں تو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے یہ عادت پیدا ہوگئی ہے کہ کچھ شروع، کچھ درمیان اور کچھ آخر سے پڑھ کر یہ معلوم کر لیتا ہوں کہ قصہ کا انجام کیا ہوا۔ میری یہ عادت اچھی نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ یہ انجام ہوا کیوں۔ لیکن اس کے لئے دس بیس صفحے کون پڑھے! اردو اور عربی زبان کی کتابوں میں تو یہ بات آسانی سے چل جاتی تھی لیکن انگریزی پر چونکہ پوری طرح قدرت نہیں تھی اس لئے وہاں یہ بات نہیں چل پاتی تھی۔ مگر عادت سے مجبور تھے۔ یہی عمل وہاں بھی رہتا تھا اور بعد میں خود اپنی شکایت کرتے تھے کہ چھوڑ چھوڑ کر پڑھتا ہوں اس لئے پوری طرح سے بات پلے نہیں پڑتی۔

مولانا میدان سیاست کے شہ سوار کبھی نہیں رہے۔ وہ کبھی جیل بھی نہیں گئے۔ میں نے انھیں کبھی سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ بایں ہمہ وہ پختہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ ان کا سیاسی ذہن الہلال اور البلاغ پڑھ کر بنا تھا۔ وہ اوائل عمر میں خلافت کے جلسوں میں شرکت کر چکے تھے۔ ذہنی طور سے وہ قوم پرور سیاست کے حامی تھے لیکن کسی جماعت کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔ تحریک عدم تعاون کے اثر سے انہوں نے بچپن ہی سے کھدر پہننا شروع کر دیا تھا، لیکن جب سے میں نے انہیں دیکھا وہ کھدر کے بجائے زیادہ تر ارکین پہنتے تھے اور کہتے تھے کہ اب کھدر کا پہننا کم آمدنی والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ پارلیمانی طرز حکومت کو اس کی تمام خرابیوں کے باوجود دوسری قسم کی حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ اسی لئے ووٹ کے استعمال پر زور دیتے تھے اور اشخاص کے پارٹی کو ووٹ دینے پر اصرار کرتے تھے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا اپنے خیالات کے اعتبار سے تمام عمر کانگریسی رہے اور غالباً انہوں نے

ہمیشہ کانگریس ہی کو ووٹ دیا سوائے ایک بار کے، جس کا ذکر میں نے ان کی زندگی ہی میں ان کا نام لئے بغیر اپنی ایک انگریزی کتاب میں کیا ہے ۱۹۴۵ء میں پاکستان کے سوال پر جب جنرل الکشن ہو رہا تھا تو مسلم لیگ کے پروپگنڈے کی وجہ سے بڑے بڑے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ پاکستان کا قیام برصغیر میں دارالاسلام کے مرادف ہے۔ مولانا اس منطق سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور کانگریس کو ووٹ دینا طے کر چکے تھے لیکن جوں جوں ووٹنگ کا دن قریب آنے لگا۔ مولانا کی ذہنی بے چینی بڑھنے لگی اور وہ اس انداز پر سوچنے لگے کہ جمعیۃ علماء ہند کا دعویٰ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل زیادہ روشن اور خوش آیند ہے۔ مسلم لیگ یہ کہتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو ایک الگ خطہ زمین نہیں ملے گا اس وقت تک برصغیر میں اسلام قائم نہیں ہو سکتا۔ صحیح علم تو اللہ کو ہے لیکن اگر جمعیت کی بات درست ہے تو ملک کے تقسیم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا موقع ملے گا اس لئے اگر متحدہ قومیت والا افار مولا درست ہے تو آزاد ہندوستان میں اس کا مظاہرہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر مسلم لیگ اپنے دعوے میں صادق ہے تو جب تک اسے کوئی علاقہ نہ ملے اس وقت تک اس کا امتحان نہیں ہو سکتا۔ اگر پاکستان بن جانے کے بعد وہاں اسلام قائم نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے سامنے مطالبہ پاکستان کے حامی لوگ جوابدہ ہوں گے۔ لیکن اگر مسلم لیگ کی منطق درست ہے اور مسلمانوں کے ووٹ نہ دینے کے باعث پاکستان نہیں بنتا تو پھر وہ تمام مسلمان خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو پاکستان کے خلاف ووٹ دیں گے۔ گویا مولانا کی منطق کے مطابق پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیا اور مطالبہ پاکستان صرف ایک ووٹ کی کمی کی وجہ سے منظور نہ ہو سکا تو اس کی ذمہ داری براہ راست انہیں کے سر ہو گی۔ بہر حال یہ فرض کفایہ والی بات مولانا کے ذہن پر اتنی طاری ہوئی کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ دے آئے۔ میرے اس پوچھنے پر کہ ووٹ دینے کے بعد آپ پاکستان کیوں نہیں گئے انہوں نے کہا کہ میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ اسلام کے قیام کے لئے ایک الگ خطہ زمین چاہیئے۔ جن لوگوں نے دعویٰ کیا تھا انھیں پر فرض تھا کہ وہ پاکستان جائیں اور اپنے دعوے کو صحیح ثابت کریں۔

مولانا اپنے استاد حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ کے وسیلے سے مہاجر مکی حضرت حاجی امداد اللہ کے سلسلے میں اپنی نوجوانی ہی میں بیعت ہو چکے تھے۔ اب یا تو اس سلسلے کی خصوصیت ہے یا یہ بھی مولانا کی اپنی

انفرادیت تھی کہ ان کے رات و دن کے ساتھیوں کو بھی شبہ تک نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ عملاً حلقہ تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوتے میں وہ اوراد و وظائف پڑھتے رہے ہوں تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن ویسے کبھی بھی میں نے انھیں مراقبہ کرتے، یا متعین اوقات پر ذکر خفی یا ذکر جلی میں مشغول نہیں دیکھا۔ دراصل مولانا کی زندگی میں عبادت کا الگ سے کوئی خانہ نہیں تھا۔ زندگی کے اور تمام کاموں کی طرح عبادت کو بھی وہ ایک کام سمجھتے تھے اور دوسرے کاموں کی طرح اسے سہج سہج کر ایمانداری سے کرتے تھے۔ وہ دن میں کوئی نہ کوئی موقع نکال کر تھوڑی سی تلاوت کر لیتے تھے، پانچوں وقت کی فرض اور ضروری مسنون رکعتوں کی ادائگی کے پابند تھے۔ "نوافل" کو واجب کی طرح پابندی سے ادا کرتے ہوئے میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ رمضان کے روزے وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی رکھنے شروع کر دئے تھے جس کے آخر دم تک پابند رہے۔ رہی زکوٰۃ تو جب تک کہ انھیں جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد پراوڈنٹ فنڈ نہیں مل گیا ان پر فرض ہی نہیں ہوئی۔ ہاں خیر خیرات کے لئے وہ ایک رقم ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ حساب کتاب کے کھرے تھے۔ اپنے اوپر کسی شخص کی ایک پائی بھی نہیں رہنے دیتے تھے۔ سماجی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمشہ فکر رکھتے تھے۔ ان کے یہاں جو لوگ ملنے ملانے کے لئے آتے تھے کوئی نہ کوئی موقع نکال کر وہ ان کے گھروں پر بازدید کے لیے ضرور جاتے تھے۔ اگر کسی کے یہاں مہمانی جاتے تو واپسی کے وقت صاحب خانہ کے ملازم کو انعام کے نام سے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ ہر شخص کو اس کے نام سے یاد رکھتے اور اگر کبھی کسی کو نہ پہچان پاتے تو اس پر اس کا اظہار نہ ہونے دیتے بلکہ اس سے گفتگو اس انداز سے کرتے رہتے کہ اسے شبہ بھی نہ ہونے پاتا کہ مولانا نے اسے پہچانا نہیں ہے۔ خطوں کا جواب فرض سمجھ کر دیتے تھے لیکن لکھتے ہمیشہ پوسٹ کارڈ تھے۔ لفافے وغیرہ شاذ و نادر ہی استعمال کرتے مگر ان کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ دوسروں کے دو تین پوسٹ کارڈوں کے برابر ہوتا تھا۔ گفتگو مخاطب کے ذوق کے مطابق کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ملنے والوں میں اگر ایک طرف جامعہ کے اساتذہ، اہل فکر اور دانشور حضرات تھے تو دوسری طرف ان کے پاس آکر بیٹھنے والوں میں جامعہ نگر کے کسان، معمولی ملازمین اور خالص دیہاتی اور کاروباری لوگ تھے اور یہ تمام لوگ مولانا سے گفتگو کرنے کے بعد یکساں طور سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔

جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ مولانا اپنے متوسلین کی فلاح و بہبود کی فکر میں ہر وقت لگے رہتے تھے ۱۹۶۶ء میں جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مطالعہ اسلامیات کا پروفیسر

ہو کر آیا تو مولانا نے اپنے کئی خطوں میں دلی خوشی کا اظہار کیا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ مجھے مزید مطالعہ کرنے پر ابھارتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس میں ایک طرح سے انہوں نے میرے لیے مطالعہ اسلامیات کا نصاب بنا کر بھیجا تھا۔ خط کا نصف اول ان کے بڑے لڑکے سالم کے متعلق ہے۔ نصف آخر میں لکھتے ہیں:۔

"خیر یہ تو سالم کے بارہ میں تھا۔ اب جی چاہتا ہے کہ تم سے بھی کچھ کہوں۔ اگرچہ رئیس احمد جعفری مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ بے طلب مشورہ نہ دیا کرو مگر خلوص کی بنا پر ان کی رائے پر عمل نہیں کر پاتا ہوں اور خواہ مخواہ مشورے دیتا رہتا ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم کو پروفیسر اسلامیات اور صدر شعبہ بنا دیا ہے اس لئے تھوڑا وقت اسلامیات کے مطالعہ پر ضرور لگاؤ کسی ترجمے کے ساتھ قرآن مجید کا (ھکذا) پڑھ ڈالو۔ انگریزی میں عبداللہ یوسف علی اور اردو میں مولانا آزاد اور مودودی صاحب کے ترجمے مناسب رہیں گے۔ تاریخ اسلام کی کوئی ایک مختصر کتاب اگر زیادہ موقع نہ ہو تو ہماری بادشاہی پر ایک نظر ڈال لو۔ اس سے پوری اسلامی تاریخ اور مسلم حکومتوں کا ایک تصور ذہن میں آجائے گا۔ اسی طرح مشکوٰۃ پوری مظاہر حق کے ساتھ پڑھ ڈالو اس سے تم احادیث کے ذخیرہ سے فی الجملہ باخبر ہو جاؤ گے۔ مظاہر حق شاہ عبداللہ رحمۃ اللہ کی مختصر شرح ہے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، ۲۰ منٹ روز بھی صرف کرو گے تو انشاء اللہ ایک سال میں پوری مشکوٰۃ کے مطالب ذہن نشین ہو جائینگے۔

فقہ میں قدوری پوری پڑھ ڈالو، عبادات کے مسائل تو جانتے ہی ہو جی چاہے اتنا حصہ چھوڑ دو۔ باقی معاملات، قضا شفعہ، حوالہ، وکالۃ، بیوع، نکاح، طلاق، خلع وغیرہ تم کو خاص طور سے پڑھنا چاہیئے کیونکہ معاملات ہی میں زمانہ کے تغیرات کی بناء پر اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدوری مرکزی متن ہے اس کو پڑھ لیتے تو پورا اسلامی قانون جو سابق مسلم حکومتوں کے دور میں نافذ تھا تمہاری نظر میں آجائے گا۔ قدوری کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کتاب اصول فقہ کی ضروری ہے۔ اصول الشاشی چھوٹی سی کتاب ہے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ علی گڑھ میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں میں نے

دیکھا تھا۔"

مولانا کے انداز شکایت پر بھی بے اختیار پیار آتا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں جامعہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے عنوان پر ایک سیمینار ہونے والا تھا، مولانا بھی اس میں مدعو تھے۔ سیمینار کے سلسلے کی خط و کتابت میرے سپرد تھی۔ ان دنوں مولانا کے بعض خطوط عدیم الفرصتی کے باعث جواب دینے سے رہ گئے اس پر انہوں نے اعظم گڑھ سے ایک چھوٹا سا پرچہ کسی اور کے خط میں رکھ کر میرے پاس بھیجا۔ شکایت کا انداز دیکھئے:۔

"اب تو شاید کئی خطوں کے بعد تم جواب لکھو گے۔ کبھی کبھی شکایت ہو جاتی ہے۔ دہلی آیا تو باتیں ہوں گی۔ میرا جی یہاں سے اُکتا گیا ہے دیکھو کب اور کس طرح فرصت ملتی ہے۔ اب جی چاہتا ہے زندگی کے آخری دن فرصت، اطمینان، بے فکری اور سکون سے گذاروں۔ جھمیلوں میں طبیعت گھبراتی ہے۔"

جامعہ کے احاطہ میں ایک ٹیلے کے اوپر بہت ساری قبروں کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی بھی قبر ہے ان کی قبر پر قرآن کی آیت "یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین" کندہ ہے۔ قبروں پر کندہ کی جانے والی دوسری آیتوں کے مقابلے میں مولانا اس آیت کو بہت پسند کرتے تھے اور اس شخص کے ذوق کی داد دیتے تھے جس نے ڈاکٹر انصاری کے کتبہ قبر کے لئے اس آیت کا انتخاب کیا تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ کاش پیچھے رہ جانے والوں کو کسی طرح معلوم ہو سکتا کہ مرنے والا اپنے کس عمل کی بنا پر بخشا گیا ہے۔ اب جب کہ میرے مولانا خود زمرۃ "مکرمین" میں داخل ہو چکے ہیں تو ان کے دل کی کرید تو ختم ہو گئی ہو گی لیکن ہماری خاطر تو وہ کہتے ہی ہوں گے کہ،

"یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین"

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی یاد میں

مولانا ابوالعرفان ندوی

صدر شعبۂ علوم دینیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی میرے استاذ مربی اور محسن تھے، ان کی شفقت و عنایت میرے حال پر ۳۹ء سے شروع ہو کر ۷۹ء ان کی وفات تک مسلسل چالیس سال برابر قائم رہی اس لئے جب عید بعد شوال کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو میرے ایک عزیز ندوی نے جونپور میں ان کے حادثہ وفات کی اطلاع زبانی دی تو مجھ پر شدید احساس اور حزن و غم کی کیفیت طاری ہوئی اور میں نے اس عزیز سے وہ اخبار لے کر مزید توثیق کی جس میں اس حادثہ کی خبر درج تھی، چالیس سال کا یہ طویل عرصہ نظروں کے سامنے پھر گیا اور ان کی محبت و شفقت اور عنایت کے واقعات ایک ایک یاد آنے لگے۔

۳۹ء میں جب میں پہلی بار ندوہ میں داخلہ کے لیے آیا تو سیدھے مولانا مرحوم کی قیام گاہ شبلی ہوسٹل کمرہ ۹ میں پہنچا اور اپنا سامان بھی مولانا کے کمرہ میں رکھا، یہ مولانا مرحوم سے میری ملاقات کا پہلا دن تھا۔ مولانا مرحوم اس وقت دارالعلوم کے صف اول کے استاد تھے اور اس وقت کے بڑے لڑکوں کے دارالاقامہ شبلی ہوسٹل کے نگراں و اتالیق تھے اس لئے قدرتی طور پر مولانا مرحوم سے ہر وقت سابقہ رہنے لگا، اور بہت جلد میں نے اپنے کو مولانا سے ذہنی طور پر قریب کر لیا، مولانا مرحوم کا تعلق شبلی ہوسٹل کے تمام طلبہ سے بہت محبت و شفقت کا رہا کرتا تھا اور خاص کر مولانا جن طلباء کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق خصوصی ہدایات سے اس کو فائدہ پہنچے گا، اس سے خود مولانا بہت قریب ہو جایا کرتے تھے۔ میرا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس وقت کے درجہ ہفتم عربی میں ہوا، درجہ ششم عربی میں عالم کی سند ملتی تھی اور درجہ نہم عربی میں فضیلت کی سند طالب علم پاتا تھا، یعنی درجہ فضیلت تین سالہ نصاب کا تھا، اور میرا داخلہ فضیلت کے پہلے سال میں ہوا، اس سے پہلے تک میری تعلیم کا بڑا حصہ اگرچہ شخصی اساتذہ کا مرہون منت رہا لیکن مدرسوں سے متعلق ہو کر۔ ان مدارس میں درس نظامیہ کا نصاب درس رائج تھا، ندوہ میں آکر مجھے نئے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم سے سابقہ پڑا اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی عربی مدرسہ میں طلبہ کی یونین اور اس میں اخبارات و رسائل اور کتابوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم طلبہ کو ان کی ذہنی و فکری استعداد و صلاحیت کو دیکھ کر خارجی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا کرتے تھے، اس معاملہ میں ان کی قوت فیصلہ اور ارشاد و رہنمائی کی صلاحیت بڑی ممتاز تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت کے دارالعلوم کے اسٹاف میں مولانا اس حیثیت سے منفرد تھے کہ خارجی مطالعہ اور اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر جو کتابیں اس وقت تک آچکی تھیں ان پر مولانا کی گہری نظر تھی اور ہر کتاب کا اپنے موضوع پر جو مقام تھا اس کی صحیح تشخیص کا بڑا ملکہ تھا اور اسی طرح ان کتابوں کے مصنفین کے بارے میں ان کی معلومات بہت ہی تفصیلی اور مفید ہوا کرتی تھی، مولانا کی رہنمائی اور نگرانی میں کتابوں کا مطالعہ بہت ہی مفید ہوتا تھا اور جو لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے وہ بہت جلد اپنے عام مطالعہ کی سطح بہت بلند محسوس کرنے لگتے تھے، مولانا اس بات کی بھی فکر رکھتے تھے کہ جب کسی طالب علم کو کسی کتاب کا مشورہ دیتے تھے تو دو چار دن کے بعد اس سے پوچھتے بھی تھے کیا تم نے وہ کتاب پڑھی اور اگر پڑھ رہے ہو تو کہاں تک پڑھی ہے، اگر وہ یہ محسوس فرماتے تھے کہ طالب علم کا مطالعہ صحیح راہ پر چل رہا ہے تو پھر اس کتاب کے اہم ابواب اور مطالب پر کچھ زبانی فرما دیا کرتے تھے۔ طلباء دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کی کتابوں سے استفادہ جتنا بہتر مولانا مرحوم کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد ایسا مرتب اور منظم اور مفید مطالعہ کا دور نہیں آیا۔ درحقیقت دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی انجمن الاصلاح ان کی عام علمی استعداد کو وسیع کرنے اور علمی و فکری سطح کے بلند کرنے میں بہت معین و مددگار ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ انجمن الاصلاح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام تعلیم کا ایک اہم اور مفید جزء ہے جو طلباء انجمن کی اس حیثیت کو سامنے رکھ کر اس سے استفادہ کریں گے، انشاء اللہ ان کے لئے الاصلاح بہت نافع و مفید ثابت ہوگی، افسوس ہے کہ مرتب اور منظم مطالعہ کی عادت عزیز طلبہ کو نہیں ہے اس لئے وہ انجمن الاصلاح سے وہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے مولانا مرحوم سے اثناء گفتگو میں میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی نگرانی کے دو حصے ہیں اور یہ دونوں حصے اپنی جگہ پر اہم اور ضروری ہیں، ایک عام قواعد و ضوابط کی پابندی، پنجگانہ نماز باجماعت کی ادائیگی کی طرف توجہ، پابندی سے درجات میں حاضری کا خیال وغیرہ وغیرہ اور دوسرا حصہ طلبہ کی ذہنی و فکری تربیت و اصلاح، مفید

کتابوں کی طرف ان کی رہنمائی اور ان کی عمومی ثقافت کی سطح کو بلند کرنا ہے، میں نے مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ یہ حصہ آپ کی نگرانی میں بہت کامیابی سے انجام پاتا تھا اب سرے سے یہ حصہ ختم ہو چکا ہے اور یہ ایسا خلا ہے جس کا پر ہونا ضروری ہے، اگر آپ اس کی طرف بحیثیت معتمد تعلیم توجہ فرمائیں تو زیادہ بہتر تھا، بات چونکہ مولانا کی ذات سے متعلق تھی اس لئے زیادہ صفائی سے تو نہیں فرمایا لیکن اس کی ضرورت و اہمیت کا اعتراف کیا۔

مولانا مرحوم کے اوصاف میں سے ایک وصف نرم خوی اور ملاطفت بھی تھی اپنے اتالیقی کے عہد میں ہم طلباء کو وقتاً فوقتاً فارسی کے اس شعر کی طرف متوجہ فرمایا کرتے تھے ع

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

مولانا مرحوم کی پوری زندگی اس شعر کا نمونہ اور مصداق تھی، اتالیقی کی خدمت اور ذمہ داری ایسی ہے کہ اس میں زجر و توبیخ اور تنبیہ و تادیب اور سزا و عقوبت ایک ناگزیر مرحلہ ہے لیکن مولانا مرحوم ایسے مواقع پر جس خوش اسلوبی اور حکمت کے ساتھ صورتحال پر قابو پاتے تھے وہ بیان سے باہر ہے، ناگوار و سخت لہجہ میں کسی طالب علم سے گفتگو کرنا اور تہدید و توبیخ کے کلمات استعمال کرنا مولانا جانتے ہی نہیں تھے اور یہی وجہ ہے بعض شرپسند طبیعتیں جو سختی اور تلخی کی عادی ہوتی ہیں اور بغیر اس کے ان کی اصلاح نہیں ہوتی ہے وہ مولانا کے اس اتالیقی اور نگرانی کے نظام سے بہت غلط فائدہ اٹھاتی تھیں لیکن مولانا کی اتالیقی سے ان طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا تھا، جو مولانا کے لطیف اشاروں کو بھی اپنے لئے بہت بڑی تنبیہ سمجھتے تھے۔

اردو زبان میں اس وقت تک جتنے علوم و فنون پر کتابیں طبع ہو چکی تھیں مولانا مرحوم کو ہر کتاب اور اپنے موضوع پر اس کے درجہ و مقام اور اس کے مصنف کی منزلت کا تفصیلی علم تھا اور جب مولانا کسی کو کسی کتاب کے پڑھنے کی ہدایت کرتے تھے تو اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مصنف کے مقام و منزلت سے بھی آگاہ فرمادیا کرتے تھے اور اس سے ہم طلبہ کو کتاب کے پڑھنے میں اور اس سے استفادہ میں بڑی مدد ملتی تھی، غیر درسی کتب کے مطالعہ کے لئے مولانا ایک بہترین مرشد و رہنما تھے۔

درسی مضامین میں مجھے مولانا مرحوم سے تاریخ اسلام، ابوداؤد شریف اور مقدمہ ابن خلدون پڑھنے

کی سعادت حاصل ہوئی، تاریخ اسلام پر مولانا کی نظر بہت گہری اور تفصیلی تھی اور مولانا درس میں ان واقعات کی نشاندہی فرماتے جاتے تھے جن کی حیثیت سنگ میل کی ہوتی تھی اور طالب علم میں تاریخ کے فن سے ایک ذوق پیدا ہو جاتا تھا، چونکہ مولانا مرحوم ہمارے نگراں بھی تھے اور مولانا کا قیام رواق شبلی کے مشرقی بازو میں تھا اور میں بھی اسی حصہ کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، اس لئے برابر میں یہ دیکھتا تھا کہ ابوداؤد شریف کے درس کے لئے مولانا کس اہتمام سے مطالعہ فرماتے تھے۔ اور باقاعدہ تیار ہو کر درس میں تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا مرحوم کی عام شہرت ایک مؤرخ اور ادیب کی حیثیت سے ہے لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ فن حدیث میں ان کی نظر گہری تھی اور انھوں نے یہ فن مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم سابق شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اپنے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا اور ان کو شیخ صاحب مرحوم کی ذات سے غیر معمولی تعلق و عقیدت بھی تھی جس پر ان کا مضمون گواہ ہے۔ استاذ حدیث سے یہ قلبی ربط و تعلق کی وجہ بھی یہی ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنے استاذ سے فن حدیث بہت محنت و توجہ سے پڑھا تھا، مولانا مرحوم کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک بڑی صفت کتمان تھی وہ اپنی فضیلت و لیاقت دوسروں پر مسلط نہیں کرتے تھے، اس لئے بہت کم لوگوں کو ان کے مقام و منزلت کا احساس ہوتا تھا۔

ہندوستان میں تحریک خلافت سے لے کر مسلمانوں کے اہم دینی علمی اور سیاسی تنظیمات و تحریکات اور اشخاص کے متعلق ان کا علم بڑا گہرا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۳۵ء سے ۴۷ء تک کا عہد بہت ہی گوناگوں اہمیتوں کا حامل ہے، ہندوستان کی سیاسی جدوجہد برطانوی استعمار سے مقابلہ اپنی آخری منزل میں داخل ہو رہی تھی اور ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور مسلم و غیر مسلم زعماء کی قربانیاں اور کوششیں ثمرات و نتائج کی شکل میں ظاہر ہونے والی تھیں، ہندوستان نے واضح طور پر آزادی کی ایک ابتدائی قسط ۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعہ حاصل کی اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان کے تمام صوبوں میں بااختیار اور منتخب ہندوستانی نمائندوں پر مشتمل حکومتیں بنیں، اسی عہد میں ۳۹ء سے ۴۵ء تک وہ مشہور عالمگیر جنگ ہوئی ہے جس نے پورے عالم کا جغرافیہ بدل ڈالا اور ساری دنیا اس سے متاثر ہوئی، اسی عہد میں ۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں اس برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو مملکتوں کا قیام عمل میں آیا اور اسی عہد میں ۳۷ء سے ۴۷ء تک کانگریس و مسلم لیگ کی آویزش اپنے شباب پر تھی اور اسی شدید اختلاف کی حالت میں ۴۰ء میں مسلم لیگ نے

ہندوستان کی تقسیم اور نئی مسلم اسٹیٹ کے وجود کا مطالبہ کیا۔ مسلم رائے عامہ نے اس مطالبہ کو جس تیزی سے قبول کیا ہے اور اس پر متفق ہوئی ہے اتنا بڑا اتفاق تحریک خلافت کے بعد کسی اور بات پر نہیں ہوا تھا یہاں تک کہ یہ مسئلہ مسلم لیگ کے مطالبے کے بجائے پورے ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبہ بن گیا، اس کے نتیجہ میں ہندو و مسلم منافرت بھی اپنے برے اثرات دکھانے لگی تھی، مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم ان تمام سیاسی معاملات میں اپنی ایک پختہ اور علیٰ وجہ البصیرت رائے رکھتے تھے اور جب مجلسوں میں ان تمام چیزوں کو شرح و بسط کے ساتھ فرمایا کرتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اور سننے والوں کو بہت سیاسی اور تاریخی نفع پہنچتا تھا۔ مولانا مرحوم کا رجحان نیشنلسٹ جماعتوں کی طرف تھا لیکن مولانا نے کبھی بھی دارالاقامہ میں اپنی اس رائے کو دوسروں پر نہیں تھوپا اور نہ سیاسی معاملات میں طلبہ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جو لوگ مولانا کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے اور ہندوستان کی سیاست پر ان کی رائے اور گفتگو سنتے تھے وہ متاثر ضرور ہوتے تھے اور اسی طرح طلبہ کی بڑی تعداد اپنے سیاسی آراء میں نیشنلسٹ خیالات کی تھی۔

مولانا کے علمی افادہ و افاضہ کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا بلکہ جس وقت بھی ان سے کوئی بات پوچھ لی جاتی وہ برجستہ اس کو تفصیل سے بیان فرماتے اور کبھی تو یہ مجلس درس کھڑے کھڑے ہوا کرتی تھی اور بہت دیر تک اس کا سلسلہ قائم رہتا اور جب کوئی طالب علم ان سے کسی تحریک کے بارے میں یا کسی اہم تاریخی واقعہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا تو مولانا مرحوم بڑے انشراح و مسرت کے ساتھ اور بہت مزہ لے لے کر اس بات کے جملہ متعلقات بیان فرماتے تھے۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں چار ایسے اساتذہ تھے جن سے علمی و فکری استفادہ عام طور پر طلبہ کیا کرتے تھے اور یہ چاروں استاذ دارالعلوم کی صفِ اول کے ممتاز اساتذہ میں تھے، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم جن کی وسعت معلومات اور قوت حافظہ ضرب المثل تھی، اہم سے اہم اور دقیق سے دقیق مسائل کے سمجھنے میں جب مولانا مرحوم سے رجوع کیا جاتا تھا تو وہ برجستہ اس موضوع سے متعلق کتاب و مصنف کے حوالہ کے ساتھ زبانی عبارت پڑھنا شروع فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی اس موضوع پر مولانا کتاب دیکھ کر چلے آرہے ہیں، کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلے سے اگر یہ معلوم کرنا ہوتا کہ یہ بات کس کتاب میں ملے گی تو مولانا مرحوم فوراً کتاب کا حوالہ بتلاتے تھے، اور اگر یہ کتاب کتب خانہ میں ہوتی تو فوراً کتاب نکلوا کر مطلوب کتاب کے جس حصہ میں ہوتی تھی کھول کر دکھاتے۔ فن حدیث اور اس کے متعلقات پر شاہ صاحب مرحوم کی نظر بہت ہی گہری اور محققانہ تھی، شاہ صاحب سے صحیح استفادہ وہی کر سکتا تھا جو پہلے سے بھی معلومات کا ذخیرہ رکھتا ہو، اس لئے عام طور پر ہم طلبہ کا ان سے استفادہ مجلس درس تک محدود رہتا تھا۔

دوسری شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء دامت برکاتہم کی ہے، ذہن و فکر کو صحیح سمت میں موڑ دینا اور طالب علم کی فکر و تدبر کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دینا مولانا کی خصوصیت خاصہ تھی اور ہے۔ اور زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک الحمدللہ مولانا مدظلہ سے میرا استفادہ جاری ہے، دینی اور علمی، فکری اور دعوتی میدان میں مولانا کے جو کارہائے نمایاں ہیں اور جو تصانیف کثیرہ ہیں، اس مضمون میں اس کی تفصیل کا موقعہ بھی نہیں ہے، وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

تیسری شخصیت استاذ محترم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ہے، جو اس وقت کراچی میں مقیم ہیں، ادب اور اس کے متعلقات پر مولانا کی نظر بہت عمیق اور وسیع تھی، مجھے زمانہ طالب علمی کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کسی خاص لفظ یا عربی کے کسی خاص جملے یا کسی شعر کا مطلب پوچھنا چاہا تو برجستہ مولانا فرماتے کہ کیا تم آج کل فلاں کتاب دیکھ رہے ہو اور واقعہ بھی یہی ہوتا تھا میرے ہاں کہنے کے بعد مولانا پھر اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے اور دوسرے شواہد اور متعلقات کو بیان کر دیا کرتے تھے اور چوتھی شخصیت مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی تھی، بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُردو ادب کے پورے سرمایہ پر مولانا مرحوم کی نظر تھی، میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۳۵ء سے لے کر ۴۵ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ میں جس کو جو کچھ بھی حاصل ہوا وہ انھیں چار مذکورہ بالا حضرات کے ربط و تعلق اور علمی استفادہ سے حاصل ہوا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں اور خوردوں کو بھی خصوصی اہمیت دیا کرتے تھے اور ان سے بھی رائے و مشورہ لیا کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کا طرز عمل اور انداز گفتگو اس طرح ہوتا تھا کہ گویا ایک دوست اپنے دوسرے دوست سے مشورہ لے رہا ہے، مولانا مرحوم اپنی رہائش اور لباس اور کھانے میں مزاجاً بہت سادہ تھے، لیکن ان کا ذوق اور معیار ان سب چیزوں میں بہت بلند تھا، طلبہ کی عزت نفس اور ان کی خودداری کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کو رکھ رکھاؤ کی بڑی ہدایت فرمایا کرتے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ

زمانہ طالب علمی میں مجھے اہتمام کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ شیروانی پہنا کرو میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس صرف ایک شیروانی ہے جو اس وقت دھلنے کو گئی ہے تو فرمایا دوسری بھی بنوالو، چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں میں نے ایک اور شیروانی بنوائی اور میرے پاس دو شیروانی ہوگئیں۔

مولانا مرحوم کی وفات سے میں اپنے ایک شفیق استاذ اور ایک ہمدرد و بہی خواہ سے محروم ہوگیا اور یہ میرا ایک ذاتی نقصان ہے۔ مولانا مرحوم نے ہمیشہ مجھے عرفان کہہ کر پکارا اور ان کے اس طرح آواز دینے میں میں جو اپنائیت و حلاوت محسوس کرتا تھا، اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں بے شک صرف عرفان کہنے کا حق رکھنے والے اب بھی کچھ بڑے موجود ہیں لیکن کہتے صرف حضرت مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ہی تھے۔

رحمہ اللہ وغفرلہ مغفرۃ واسعۃ

دین وملّت کے سپاہی

عربی مدارس کے قیام کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین وملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کرسکیں اور الحاد و بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں، آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا، اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے، جب تک وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جب کہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کرسکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتیٔ ملت کے ناخدا ہوں گے۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

علم وتعلیم کی فکرمندی

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے خطوط کی روشنی میں

(مولانا محمد رابع حسنی ندوی، صدر شعبۂ ادب عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی شخصیت گوناگوں قسم کے اوصاف کی حامل رہی ہے وہ علمی وادبی میدان میں نمایاں شخصیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے استاد، اچھے مصنف اور اچھے ماہر تعلیم تھے، ان کو بیک وقت علوم دینیہ میں بھی نمایاں دستگاہ حاصل تھی اور علوم حاضرہ میں بھی مولانا ضروری واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم گاہ سے جس نے علوم دینیہ اور علوم حاضرہ کو جمع کرنے کا ایک انقلابی تجربہ کرنے کی کوشش کی تھی پورا استفادہ کیا تھا۔ وہ ایک طرف قرآن وسنت کے علوم سے آگاہ تھے، دوسری طرف انھوں نے علم کلام اور تاریخ وادب میں بھی مقام پیدا کیا تھا، عصر جدید کی ضرورتوں کو سمجھنے کے لئے انگریزی زبان کی ضروری صلاحیت بھی حاصل کرلی تھی، چنانچہ وہ مراکز دینیہ کے علمی وتعلیمی ماحول میں ممتاز شخصیتوں میں شمار کئے گئے اور انھوں نے عصری تعلیم کے ماحول میں بھی قدر ومنزلت حاصل کی۔ ان کو ندوۃ العلماء میں تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد جامعہ ملیہ میں بھی فائدہ پہنچانے کا موقع ملا، پھر وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک طرف ندوۃ العلماء کے اعزازی معتمد تعلیمات رہ کر ندوۃ العلماء کے مقاصد وتعلیمی نظریات کو مفید طریقہ سے بروئے کار لانے میں اپنے مشوروں اور رہنمائیوں سے فائدہ پہونچایا دوسری طرف دارالمصنفین جیسے وقیع تحقیقی وتصنیفی ادارہ کی سرپرستی بھی کی، انھوں نے ان تمام جگہوں اور منصبوں میں اپنے قیمتی تعاون ورہنمائی کے ایسے آثار چھوڑے جن کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔

مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت ایک بڑے استاذ کے اچھا عرصہ گزارا تھا اور دارالعلوم میں رہتے ہوئے دارالعلوم کے طلبہ اور وہاں کی علمی وادبی زندگی میں اچھی رہنمائی کا فرض انجام دیا تھا پھر انھوں نے شہر لکھنؤ میں ہی عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کا ایک مختصر اور مفید نظام چلایا تھا، اس

سلسلہ میں انھوں نے ایک جامع اور مفید نصاب بھی تیار کیا تھا، بعد میں ان کو جامعہ ملیہ میں ناظم دینیات کی حیثیت سے بلالیا گیا، وہاں ریٹائرمنٹ کی عمر تک وابستہ رہے، وہاں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات کی ذمہ داری سنبھالی اسطرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وطلبہ سے دوبارہ اور زیادہ ذمہ دارانہ طریقے سے تعلق پیدا ہوا اور انھوں نے دارالعلوم کی ترقی میں پورا حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے شریک ناظم بھی منتخب ہوئے، اور چونکہ معتمد تعلیمات دارالعلوم کے لئے دارالعلوم میں باقاعدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے قیام تو مولانا کا اصلاً دارالمصنفین اعظم گڑھ رہتا تھا لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء سے برابر ربط اور یہاں کے معاملات سے براہ راست تعلق تھا، ان کی دلچسپی کے لیے یہ بات مزید تھی کہ اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دارالعلوم کے مہتمم مولانا محب اللہ لاری ندوی ایم اے علیگ ان کے پرانے رفیق بھی تھے جن کا ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوران ساتھ رہ چکا تھا اور آپس میں ہم آہنگی اور قریبی ربط وتعلق تھا اس کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت کے سلسلہ میں اس کے تینوں بڑے ذمہ داروں کے درمیان یکجہتی اور ہم ذوقی کی اچھی صورت پیدا ہوئی۔

مولانا مرحوم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی بڑی فکر رہتی تھی وہ اس سلسلہ میں صرف اپنے ہم منصب رفقاء سے ہی مشورہ وتبادلۂ خیال پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خوردوں سے بھی بعض وقت تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

اس کا تجربہ مجھے ذاتی طور پر بھی ہوا، مولانا مرحوم سے میرا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی وساطت سے بچپنے ہی سے تھا، لیکن اس وقت مولانا کا تعلق اس شفقت کی شکل میں تھا جو خاندان کے کسی بزرگ کو اپنے کسی خورد عزیز سے ہوتی ہے، لیکن جب مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بحیثیت معتمد تعلیمات کے زیادہ قریب ہوئے تو دارالعلوم کے ایک استاد کی حیثیت سے میرے ساتھ مولانا کے تعلق میں بھی اضافہ وتبدیلی ہوئی، اس وقت مولانا مرحوم کی مذکورہ بالا صفت کا قریب سے اندازہ ہوا، مولانا مرحوم جب کسی موقع پر خطوط تحریر فرماتے تو اس میں بھی مولانا کی اس فکرمندی کا اظہار ہوتا اور بعض مرتبہ مولانا مرحوم زیادہ تفصیل اور بے تکلفی سے کام لیتے۔

ذیل میں مولانا کے اس پہلو کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا اپنے ایک مکتوب میں جو ستمبر ۴۲ء کا لکھا ہوا ہے، بعض اساتذہ کے متمرد اور کمزور ہوجانے اور

بعض کے سفر پر جانے پر اپنے احساس اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کے معاملات میں فکرمندی کا اظہار فرماتے ہیں:۔

"مجی علی صاحب کے نام جو کارڈ لکھا تھا وہ امید ہے کہ تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا، امسال مدرسوں کی بڑی کمی ہوگی، مولوی عبدالنور اور ارشاد جاچکے، خطیب صاحب کا استعفا آگیا، مولانا وجیہ الدین ازکار رفتہ ہورہے ہیں۔ اب کام چلانے کی یہی شکل ہے کہ تم اپنے شاگردوں پر نظر ڈالو، فضیلت سے فارغ ہونے والوں میں سے کتنے مزید تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، تم کس کس کو اہل سمجھتے ہو، ادب ودینیات دونوں کے حساب سے سوچو، تخصص کے جن طلبہ نے امتحان دیا ہے ان میں کتنے اہل نکل سکتے ہیں، خوب غور کرلو۔"

مولانا اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جلال صاحب مقدمہ میں کامیاب ہوگئے ہیں، ان کی جگہ ایک اچھا انگریزی ماسٹر رکھنا پڑے گا اور ایک ماسٹر شاہد صاحب کے ضعف کی بناء پر.... ضمیر صاحب بھی خاصے کمزور ہیں، بہرحال دو اچھے انگریزی داں اگر آجائیں تو ان کے ساتھ شاہد صاحب اور ضمیر صاحب کچھ عرصہ اور چل جائیں گے۔"

آگے مولانا گرانی کا ذکر کرتے ہیں اور منتہی تعلیم کے طلباء کے وظائف کے بارے میں اضافہ کی ضرورت کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔

"چھ ماہ میں گرانی کتنی بڑھ گئی ہے، دال چار روپے کیلو اور گیہوں دو روپے پہنچ گئے ہیں، تیل بارہ روپے کیلو ہوگیا ہے، لوگ کس طرح گزر کریں، وہ کس طرح بال بچوں کو پالیں، نرخ بڑھتا ہی جارہا ہے۔"

مولانا تحریر کرتے ہیں۔

"اختصاص اور فضیلت میں بھی کچھ عام وظیفہ کے علاوہ امتیازی امدادی وظائف نقد دیئے جائیں... باہر سے آنے والوں میں اگر جانچ اور تجربہ کے بعد کسی کی غیر معمولی صلاحیت ہو تو کھانے کے عام وظیفہ کے علاوہ اس کو کچھ مزید اعتراف لیاقت کا وظیفہ بھی دیا جائے۔"

مولانا آگے تحریر کرتے ہیں:۔

"مجھے کب تک آجانا چاہئے، عید بعد پہنچنے کا ارادہ ہے، چاہتا ہوں کہ ادارہ[1] کی طرح بڑی عمر کے لوگوں کا ایک کورس بھی شروع کر دوں، اگر ایسا ہو جائے تو میں بھی جم کر رہنے کی ضرورت محسوس کروں۔"

ایک بار مولانا دہلی جا کر علیل ہوئے اور ایک ماہ مسلسل علیل رہے، اس کا تذکرہ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے یکم اپریل ۷۸ء کو جامعہ نگر سے جہاں مولانا مقیم تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ جامعہ کے حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں جو کہ ان دنوں خاصے فکر و تشویش کے چل رہے تھے۔

"۶۹ نزد چوپال جامعہ نگر — ۱ر اپریل ۷۸ء

عزیزی رابع اسعدک اللہ

یہاں آکر ایسا بیماریوں میں مبتلا ہوا کہ نقل و حرکت دشوار ہے، زکام نزلاوی بخار کے ساتھ خونی بواسیر نے بہت کمزور کر دیا ہے، رات سے علاج بدلا ہے، صبح سے قدرے کمی محسوس ہو رہی ہے، اب اعظم گڑھ سے آئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔"

مولانا آگے تحریر فرماتے ہیں:

"محب اللہ اور مولوی معین اللہ، افتخار نجم الدین وغیرہ کو حالات بتا دینا۔ جامعہ کے حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں، مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ مولانا محمد علی، شیخ الہند حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے قائم کردہ ادارہ کو آفات و فتن سے محفوظ رکھے، اسی کا سہارا ہے۔"

مولوی سعید الرحمٰن اور واضح غالباً مصر کے لئے پا بہ رکاب ہوں، اللہ تعالیٰ اس سفر کو مبارک فرمائے۔

اب برابر یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔"

درجہ خصوصی کے نحو کے نصاب کے سلسلہ میں مولانا اپنے خط میں جو علی گڑھ سے نومبر ۷۳ء میں تحریر کیا تھا

---

[1] اس سے مراد ادارہ تعلیمات اسلام امین آباد لکھنؤ جس کو مولانا مرحوم اور مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے مل کر قرآن مجید اور عربی کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

لکھتے ہیں۔

بیت الفرح سر سید نگر دوڈھ پور۔ علی گڑھ

۲۶ر نومبر ۷۳ء

"عربی کا معلم" کو فرصت کے اوقات میں ایک بار شروع سے آخر تک پڑھ لو تاکہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکو۔"

تعمیرات کے سلسلہ میں مولانا اپنے خط میں جو دار المصنفین سے مارچ ۷۵ء میں تحریر کیا تھا لکھتے ہیں۔

"دار المصنفین ۱۳ر مارچ ۷۵ء

خدا کرے مسجد کے بعد نئی حاصل شدہ زمین پر بھی مجوزہ عمارتیں بننی شروع ہو جائیں، اس سلسلہ میں اساتذہ اور کارکنوں کے مکانوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔"

اور ذیل میں مولانا کا وہ مفصل مکتوب پیش کیا جا رہا ہے جو مولانا مرحوم نے اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل اعظم گڑھ سے تحریر فرمایا ہے، اور جس میں نصاب تعلیم کے سلسلہ میں متعدد امور کا تذکرہ ہے، نیز مولوی محمد الحسنی مرحوم کے انتقال سے صرف ایک ماہ بعد مولوی اسحاق جلیس ندوی صاحب کے بھی انتقال کر جانے پر اپنے تاثر کا اظہار فرمایا ہے۔

۱۲/۷/۷۹ء

دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

عزیزی رابع اسعدک اللہ تعالیٰ

خط اور معہد کا نصاب آئے ہوئے کئی دن ہو گئے، اس درمیان "معارف" کی مصروفیت ایسی رہی کہ غور کر کے جواب لکھنے کا موقع نہ ملا، رائے بریلی میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ تمھارے حافظہ نے اچھی طرح محفوظ رکھیں۔ اب ان اشارات کو کسی قدر واضح الفاظ میں مہتمم صاحب کے حوالہ کر دو تاکہ عمل میں لانے میں دشواری نہ ہو۔

معلومات کے سلسلہ میں بترتیب ہر درجہ کی سطح کے مطابق کچھ عنوانات مقرر کر دینے چاہئیں تاریخ و جغرافیہ کا تو الگ عنوان ہے ہی، کسی زمانہ میں ماسٹر عبد السمیع صاحب نے ایک مختصر سی کتاب جغرافیہ کی لکھی تھی، اب حالات بہت بدل گئے ہیں، اس لیے اس میں کافی ترمیم کی ضرورت ہے۔

طالب علم کو جغرافیہ کی اصطلاحات، ہندوستان کے طبعی وسیاسی حالات اور پھر دنیا کے سیاسی وطبعی جغرافیہ کا مختصر طور پر عام فہم زبان میں طلبہ کے سامنے ذکر کیا جائے۔ مخدومی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم نے ایک مختصر کتاب لکھوائی تھی جو شاید ۱۰۰ صفحات سے بھی کم تھی مگر تمام ضروری باتیں اس میں آگئی تھیں، لیکن طبع نہیں ہوئی تھی، طلبہ کو نوٹ کے طور پر ضروری باتیں لکھادی جاتی تھیں۔ ہندوستان کی تاریخ بھی اسی قسم کی مختصر تھی۔ "ہماری بادشاہی" میں ہندوستان کے بارے میں جو دس بارہ صفحات کا باب ہے بس اُس سے دونے ڈھائی گنے صفحات میں قدیم عہد، مسلمانوں کا دور اور انگریزی عہد اور آزادی کے بعد کے زمانہ کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے تھے۔

آگے چل کر جب دارالعلوم کی منزل شروع ہو تو وہاں اختیاری مضامین کے طور پر علوم جدیدہ کی گنجائش رکھی جائے۔ عربی مدارس میں شروع سے آخر تک تمام مضامین لازمی ہوتے ہیں اور فن کے ساتھ کتابیں بھی لازمی ہوتی ہیں، اس کی وجہ سے طالب علم پر بار بھی ہوتا ہے اور اسکی واقفیت بھی نہیں بڑھتی، اگر کتابوں کے بجائے اعلیٰ درجات میں مضمون پڑھایا جائے، استاد مطالعہ کرکے لکچر دے تو زیادہ مفید ہو۔

یہ چند باتیں تمھارے غور کے لئے لکھ دی ہیں، ہمارے منتہی طلبہ کو کم از کم ایک اسلامی اور ایک عصری مضمون سے گہری واقفیت ہونی چاہئے، اس کے بغیر ہمارا اثر نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر پڑے گا نہ قدیم پر ہم اپنے معمولی علم سے صرف عوام کے درمیان کام کر سکتے ہیں، خواص کی نگاہ میں ہمارا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

میں خود بھی ندوہ آنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں مگر میری صحت کا جو حال ہے اس کی بناء پر اعظم گڑھ سے لکھنؤ کے صبر آزما سفر کی فی الحال ہمت نہیں پاتا۔ تقریباً سارا دن بیٹھے بیٹھے گزر جاتا ہے، اس کی وجہ سے سارا بدن چور چور ہو جاتا ہے اور کئی کئی دن درد رہتا ہے، انشاء اللہ عید بعد آؤں گا اور ایک ہفتہ قیام کرکے تم لوگوں کے ساتھ نصاب ونظام تعلیم کے بارے میں مشورہ کروں گا، اس اثناء میں تم لوگ بھی غور کرلو اور میں بھی ایک خاکہ بنالوں۔

ڈاکٹریٹ کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کو آگے بڑھانا چاہئے، طلبہ کو تدریس کے لئے تیار کرنے کی مہم بھی بے حد ضروری ہے، اساتذہ میں سے کئی اب عمر رسیدہ اور خستہ حال ہو چکے ہیں۔ دو

تین سالوں میں ان کے جانشین تیار کرنے کی فکر ضروری ہے ورنہ اگر استاد لائق نہ ملے تو طلبہ کے اندر لیاقت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے، فرصت کم ہے اور کام زیادہ ہے، منزل تک پہنچنے کے لئے تیز گامی ناگزیر ہے۔

محب اللہ صاحب کی صحت اب کیسی ہے؟ کتب خانہ کا کیا حال ہے؟ عمارتیں کس مرحلہ میں ہیں؟ تحقیقات ونشریات اسلام کی کتابوں کا کیا ہوا؟ قمر صاحب غالباً واپس آگئے ہوں یا ان کا خط آیا ہو، خدا کرے نقصان سے ادارہ محفوظ رہے، مکانات کی کیا حالت ہے، امید ہے کہ اب آباد ہو گئے ہوں گے اور مزید کی فکر ہو رہی ہوگی، تکیہ کا کیا حال ہے، آج کل تو سناٹا ہوگا، علی صاحب آجائیں گے تو رمضان میں آبادی کمیت اور کیفیت دونوں میں بڑھ جائے گی۔ شیخ سہارنپور پہنچ گئے ہیں یا ابھی دہلی میں ہی ہیں، امسال ان کے یہاں توقع ہے کہ بہت بڑا مجمع ہو جائے۔

عبداللہ میاں[1] کا تقرر امید ہے کہ ہو گیا ہوگا، استاد کی تنخواہ کے علاوہ الرائد سے بھی کچھ الاؤنس مقرر کرنا چاہئے، تاکہ مالی پریشانی زیادہ محسوس نہ ہو اور کسی قدر دلجمعی کے ساتھ مطالعہ اور تعلیم میں لگ سکیں، اللہ تعالیٰ انھیں علم وعمل کی جامعیت عطا فرمائے اور اپنے باپ دادا اور بزرگوں کے نام کو روشن کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، ان کے دوسرے بھائیوں کی طرف بھی خصوصی توجہ رکھنی چاہئے۔

جولائی کے معارف میں محمد میاں کے متعلق چند صفحات لکھے ہیں، غالباً ۲۳ جولائی تک رسالہ تم لوگوں کو مل سکے۔ اس مرتبہ کاتبوں کی بے توجہی کی وجہ سے کسی قدر تاخیر کا امکان ہے۔

فقط

عبدالسلام قدوائی

کل یہ خط لکھ کر ڈاک خانہ بھیج رہا تھا کہ معلوم ہوا آج پوسٹ ماسٹر زیر رخصت ہے، اور رجسٹری نہیں

---

[1] اس سے مرحوم مولوی سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے بڑے صاحب زادہ مولوی عبداللہ حسنی ندوی مراد ہیں جو دو سال قبل دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور گزشتہ دنوں حدیث کی تکمیل میں مشغول رہے، ان کے والد کا انتقال ابھی چند دنوں قبل ہوا، دارالعلوم کے ذمہ داروں نے اب ان کے لئے باقاعدہ تدریس کی حیثیت سے تقرر کا فیصلہ کیا تھا۔

ہو سکتی، اس لئے دوسرے دن کے لئے لفافہ رکھ دیا، رات میں عشاء کی نماز پڑھ کر نو بجے کے قریب قیام گاہ پر آیا تو تمھارا تار ملا کہ اسحاق جلیس بھی رخصت ہو گئے۔ محمد میاں کی اچانک موت کی یاد تازہ ہو گئی، ابھی بیس ہی دن تو ہوئے جب وہ میرے ساتھ ۲۲ جون کو رائے بریلی گئے السران کو عرصہ سے تھا۔ بہتوں کو ہوتا ہے اور زندگی بھر رہتا ہے، ان کی حالت دیکھ کر کوئی قریبی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا مگر کیا معلوم تھا کہ چند ہی دن میں رخت سفر باندھ لیں گے، ان کی وفات کا سانحہ ان کے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ ندوہ کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے، وہ بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، علمی بھی اور عملی بھی، جو کام ان کے سپرد کیا جاتا خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے مختلف میدانوں میں ان کا تجربہ کیا گیا اور ہر جگہ کامیاب رہے، تعمیر حیات اور کتب خانہ کے علاوہ پیام انسانیت کا کام انھوں نے بہت اچھی طرح کیا، ان کی صلاحیت و کارکردگی دیکھ کر توقع تھی کہ جلد یہ پیام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائے گا۔ لیکن افسوس کہ کام ابھی ابتدائی منزل ہی میں تھا اور اس کا نقیب اٹھ گیا۔ دار العلوم کے موجودہ لوگوں میں کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا، نہ پیام انسانیت کے لئے نہ تعمیر حیات کے لئے۔ علی صاحب یہ خبر سنیں گے تو اور نڈھال ہو جائیں گے۔ ان کو اسحاق صاحب پر بڑا اعتماد تھا، وہ بھی ان کی خوب سمجھتے تھے، بڑی سرگرمی کے ساتھ دورہ کر رہے تھے، اب ان کی صلاحیت نمایاں ہوئی تھی، پاریکھ صاحب تو خود ہی بیمار ہیں۔

میرا خیال ہے کہ علی میاں کو مدینہ منورہ ہی میں اطلاع ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے وہاں وہ سکون کا موقع زیادہ پا سکیں گے، یہاں آنے پر خبر ہوئی تو تکلیف زیادہ محسوس کریں گے۔

میں تمھارے پہلے خط اور معین اللہ کے خطوط کے بعد ہی سے لکھنؤ آنے کو سوچ رہا ہوں لیکن صحت ایسی ہے کہ سفر کی ہمت نہیں پڑتی ہے، طبیعت تھکی تھکی رہتی ہے، بدن میں درد رہتا ہے۔"

مولانا مرحوم کے چند مختلف خطوط سے کچھ اقتباسات اور یہ مذکورہ بالا ان کا آخری مکتوب تقریباً پورا کا پورا پیش کیا گیا۔ ان اقتباسات سے مولانا مرحوم کی علم و تعلیم اور ندوہ کے سلسلہ کی فکرمندی کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا آج ہمارے درمیان نہیں رہے وہ اپنے مالک و پروردگار کے حضور میں پہونچ گئے جہاں پروردگار عالم ملت اور دین و علم کے لئے ان کی فکرمندیوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔

ملت اور ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں اب ان کی بیش قیمت رائیں حاصل نہ ہو سکیں گی۔ یہ ایک خسارہ ہے جس کی تلافی کے لئے اور اسی کے ساتھ مولانا مرحوم کے لئے مغفرت اور درجات کی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہم سب کی مخلصانہ دعا ہے۔

قدیم و جدید کا امتزاج

عہد عباسی میں یونانی علوم و فنون کے فروغ کے بعد ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مذہبی علوم کے ساتھ فلسفہ و حکمت اور ریاضی و ہیئت کو نصاب درس میں شامل کیا جائے تاکہ علماء کو زمانہ کے حالات کا اندازہ ہو اور جو زہر نئی راہوں سے پھیل رہا ہے اس کا تریاق تیار ہو سکے۔ نئے ابن رشد و ابن حزم اور نئے غزالی اور رازی ہوں جو حریفوں کو انہیں کے ہتھیاروں سے شکست دیں وہ نئے حالات کو سمجھیں، وقت کے تقاضوں سے باخبر ہوں، نئی تہذیب و معاشرت کا اندازہ کریں اور زندگی کے میدان میں نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر قدم رکھیں وہ کتاب و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں، فقہاء اسلام کی کاوشوں سے واقف ہوں، متکلمین کے کارناموں پر ان کی نظر ہو، اور جدید علوم و آداب سے باخبر ہوں تاکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے وہ اکسیر تیار ہو جو ملت کے امراض کہنہ کو دور کر دے اور اس کے تن ناتواں کے اندر نئی روح پھونک دے جس سے اس کے اعضاء و جوارح میں ایسی قوت و توانائی پیدا ہو جو اس کے لئے کامیابی کے دروازے کھول دے۔

(مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم)

دبستانِ ندوہ کا ایک گوہرِ شب چراغ

(پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی شخصیت اس دور قحط الرجال میں سرمۂ چشم بصیرت تھی۔ وہ علم و عمل کا سنگم تھے، پاک ذات و پاک صفات۔ وہ خیالات کے لحاظ سے روشن خیال تھے مگر عملی زندگی میں اسلامی نظریات اور مظاہر کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ان کے سوچے سمجھے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے تھے۔ دبستانِ ندوہ ان کی ذات میں پوری طرح جلوہ گر تھا۔ وہ ہماری علمی انجمن کا ایک روشن چراغ تھے۔ وہ دبستانِ شبلی کے ترجمان اور بزم سلیمانی کے رازداں تھے۔ وہ ندوہ کے مقاصد کے علمبردار تھے، ندوہ کو ایک عظیم تحریک، ایک اعلیٰ نصب العین کا ترجمان، ایک انداز فکر، ایک دبستان کا نقیب اور علمی میراث کا آئینہ دار تصور کرتے تھے۔ اپنی صبح و شام کی گفتگو میں وہ اپنے نظریات اس طرح ذہن نشین کر دیتے کہ ندوہ کے اعلیٰ مقاصد کی عظمت سے ہمارے دل سرشار ہو جاتے۔

مولانا اکثر فرماتے کہ علماء کو عمدہ لباس پہننا چاہیئے، صاف و ستھرا رہنا چاہیئے تاکہ انکے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ مولانا فرماتے کہ ندویانہ تعلیم کا عمدہ نمونہ ڈاکٹر عبدالعلیؒ ہیں جنھوں نے اعلیٰ تعلیم اپنے دور کے ماہر علماء سے حاصل کی، جدید تعلیم میڈیکل کالج سے اور یونانی طب حکیم اجمل خاں سے پڑھی، اس طرح وہ جدید و قدیم کا سنگم بن گئے۔

مولانا کو اپنے معاصرین اور اکابر ندوہ سے غیر معمولی واقفیت تھی، ان کے بارے میں مولانا جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ اشخاص اور اداروں کے بارے میں ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں اور خود اس میں ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بھی دخل تھا۔

اللہ اللہ کتنی بڑی دولت ہم سے چھن گئی۔ وہ علمی گفتگو، موقع و محل کی رعایت، قصّے اور حکایتیں، لطیفے اور ظرافتیں مگر علمی وقار اور علمی معیار کے اندر، فرماتے کہ میرا اصل شوق گفتگو

کا ہے چونکہ کلاس بھی ایک طرز کی گفتگو ہے لہذا اس کو مولانا بڑے شوق سے پڑھاتے۔

میں نے مولانا کو لکھا کہ آپ اپنی سوانح عمری مرتب کریں اور اس میں ان اہل علم کے خیالات اور تجربات بھی درج فرمادیں جن کو دیکھنے اور پرکھنے کا آپ کو موقع ملا ہے۔ غالباً اس سلسلہ میں کچھ ارادہ بھی کیا تھا مگر ادھر صحت کی خرابی کے باعث کام آگے نہ بڑھا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے کسی بچے کو عربی و اسلامیات میں اپنے ندویانہ تصور کے مطابق تعلیم نہ دلائی[1] فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ آخر تم سب کو کیوں انگریزی تعلیم کی طرف لے گئے، کیا تم کو رزق عطا نہیں کیا گیا؟ فرماتے کہ میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ فرماتے کہ اللہ نے مجھے بغیر ڈگری کے ملازمتیں عطا کیں۔ واقعی مولانا اسٹرائک کے باعث ندوہ سے جامعہ چلے گئے اور کورس پورا نہ کرنے باعث ندوہ کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ ایک بار فرمایا کہ کئی صفحات کی طویل ڈگری مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے مجھے دی تھی بس وہی ایک سند ہے، ظاہر ہے کہ وہ شخصی ہے کسی ادارہ کی نہیں ہے۔

مولانا کو جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں خلافت بمبئی میں ملازمت مل گئی اور وہ بغیر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مشورہ کے تعلیم چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سنا تو افسوس کیا اور فرمایا کہ قدوائی صاحب سمجھتے تھے کہ میں ان کو ایسی ملازمت نہیں دلا سکتا۔ مولانا کو جدید تعلیم کی تکمیل نہ کر سکنے کا بھی افسوس تھا مگر چونکہ گھریلو حالات اور عمدہ ملازمت پھر رئیس احمد جعفری کی دوستی نے ان کو بمبئی کھینچ لیا۔

وہ مولانا علی میاں ندوی مدظلہ، سے قلبی تعلق رکھتے تھے میں موجود ہوتا تو مجھ کو رائے بریلی ساتھ لے جاتے۔ ان کا ذکر فرماتے۔ ایک زمانہ میں مسلم مجلس کا زور تھا میں اور مولانا تکیہ گئے وہاں حضرت مولانا نے مسلمانوں کے بارے میں اپنی اضطرابی کیفیت کا اظہار دل کھول کر کیا اور قیادت کے لئے کسی شخصیت کے سامنے آنے پر زور دیا۔ جب ہم لوگ سوئے تو مولانا نے فرمایا کہ علی صاحب

---

[1] مگر مولانا کے بڑے صاحبزادے ندوہ کے عالم اور علی گڑھ سے عربی میں پی۔ ایچ ڈی ہیں۔

(مولانا اکثر ساتھی ہونے کے ناطے اسی طرح فرماتے تھے) پر حالات کا بڑا اثر ہے خلوص وجذبات کے باعث اضطراب محسوس کرتے ہیں۔

فرمایا کہ مولانا علی میاں نے اشخاص کی تربیت کر کے ہر کام کے لئے ایک پوری ٹیم تیار کر دی ہے اور اشخاص کا انتخاب ہر کام کے لیے نہایت موزوں کیا ہے۔

ایک بار فرمایا کہ جتنا علمی کام مولانا علی میاں نے کر لیا ہے وہ کئی نسلوں کی عظمت وعلمیت کے لئے کافی ہے۔

اکثر فرماتے کہ کوئی تاریخ اسلام کو افسانوی انداز میں صحت واقعات کے ساتھ اس طرح لکھ دیتا کہ اسلامی تاریخ کی روح مصور ہو جاتی، کبھی یہ بھی فرماتے کہ تاریخ اسلام کو اوسط درجہ کے حجم کے ساتھ ترتیب سے لکھنے کی اردو میں ضرورت ہے۔ ایک بار مولانا پروفیسر خلیق احمد نظامی سے ملنے گئے لوٹ کر آئے تو فرمایا کہ خلیق صاحب کا خیال ہے کہ اردو میں جو ضخیم جلدیں تاریخ اسلام پر منشی ذکاء اللہ نے تیار کی ہیں ان کو تلخیص وتدوین کے ذریعہ دوبارہ پیش کیا جائے، ان میں فارسی اور دوسرے بنیادی ماخذ سے مواد پوری طرح اخذ کیا گیا ہے۔

مولانا اکثر اس رائے کا اظہار کرتے کہ مسلمان خود اسلامی نظام کے دشمن ہیں وہ خود اسکے مخالف ہیں اور اسلامی زندگی کو پسند نہیں کرتے۔

مولانا دوسروں کے بارے میں بڑے تسامح اور فراخ دلی سے کام لیتے مگر خود شرعی امور کی سختی سے پابندی کرتے۔ پائجامہ ہمیشہ ٹخنے سے اونچا رہتا، بال بڑھنے نہ دیتے۔ فرماتے بھائی ہم لوگ کیا کرتے ہیں کم سے کم جو شرعی احکام ہیں ان کو الٹا سیدھا ادا کر لیتے ہیں۔

مولانا زور سے کم ہی ہنستے تھے ایک بار میں اور مولانا دونوں باغ جا رہے تھے راستہ میں ایک پاسی ملا جو کہیں سے لوٹ رہا تھا، مولانا نے پوچھا کہاں سے آ رہے ہو؟ بولا "مولانا بھیا دہی کٹھ پُت ین ماں پھنسے ہَن" کٹھ پتیا کا مطلب مولانا نہ سمجھے، کافی گفتگو کے بعد معلوم ہوا کسٹوڈین کا کوئی معاملہ تھا۔ اس پر مولانا نے میری طرف دیکھا اور ہنس کر فرمایا کہ کیسے الفاظ یہ لوگ بنا لیتے ہیں۔

مولانا کے حسن اخلاق کا عجیب عالم تھا میں ساتھ چلتا پاسی، چمار، تیلی، برہمن، قصائی کوئی ملتا سلام کرتا اور مولانا کھڑے ہو جاتے اس کی خیریت اس کے معاملات مسائل اور ذاتی حالات دریافت کرتے، مشورہ دیتے اور ایسی محبت سے ملتے کہ آدمی ان کا گرویدہ ہو جاتا، ہندو مسلمان سب مولانا کی عظمت کے قائل تھے۔

ایک بار مولانا نے مجھے ایک مشورہ دیا اور فرمایا، "من نکردم شما حذر بکنید" مگر خود ان کا عمل اس کے خلاف تھا میں نے مشورہ ناپسند کیا اور مولانا کو اس کا اندازہ ہو گیا۔ فوراً بولے بھائی معاف کرنا اگر تم کو بُرا لگا ہو۔ دو بار فرمایا تو میں پانی پانی ہو گیا۔

ایک بار مجھ سے مولانا نے پیسے لئے پھر اس کا پورا حساب کر کے واپس کر دیا اور فرمایا کہ پیسے کے معاملات میں صفائی ضروری ہے ورنہ دل میں ملال ہوتے ہوتے تعلقات مکدر ہو جاتے ہیں۔

میں نے مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کو اس وقت دیکھا جب مولانا ادارہ تعلیمات اسلام امین آباد لکھنؤ میں سرگرم عمل تھے اور میں مخدوم پور پیرزادگان سلطان پور سے تھولینڈی آیا تھا۔ میں اس وقت ۹۔۱۰ برس کی عمر کا ایک طالب علم تھا اور اردو مکتب تیسری کلاس میں تھا۔ مولانا کی عظمت وشخصیت سے کما حقہ واقف نہ تھا مگر چونکہ مولانا کا مکان میرے مکان کے سامنے تھا ہر وقت آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا اور معاشرتی زندگی میں قریبی تعلقات کے باعث میں ان کی ذات سے زیادہ مانوس ہو گیا۔ مولانا عموماً گرمیوں کی چھٹیوں میں مع اہل وعیال تشریف لاتے اور دو ماہ قیام فرماتے۔ درمیان میں بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے اور ان کی آمد سے تھولینڈی کی فضا پر نور بن جاتی۔

ماہ مئی کی شدید گرمیوں میں مولانا کے گھر میں ڈرائنگ روم کے بعد والا کمرہ نہایت ٹھنڈا رہتا ہے، میں ان کے گھر چلا جاتا اور دوپہر بھر انہیں کی خدمت میں گذارتا۔ وہیں قیلولہ کرتا اور کبھی کبھی عشاء کی نماز پڑھ کر مولانا کے ساتھ واپس آتا۔ مولانا اپنے گھر چلے جاتے اور میں اپنے گھر۔ اس طرح پانچ وقت نمازوں میں اور گھر میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ اکثر محفل مولانا کے دروازہ یا ہمارے دروازہ پر ڈاکخانہ میں جمتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا صبح کو خط لکھنے یا ڈالنے کے لئے تشریف لاتے۔ اس وقت ڈاک خانہ ہمارے گھر میں تھا۔ کبھی باہر بیٹھ جاتے اور کبھی گھر آ جاتے اور وہیں خط لکھنا شروع کر دیتے اور ساتھ ہی گفتگو بھی فرماتے رہتے۔

جب مولانا کے بارے میں یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں تو ہزاروں محفلیں ذہن کے گوشوں سے اُبھر رہی

ہیں۔ صبح دوپہر شام اور رات کے کتنے مناظر ہیں جہاں مولانا کی باغ و بہار شخصیت سراپا نور بن کر نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اللہ اللہ کیسی کیسی پر نور صحبتیں گذری ہیں۔ مولانا کے الفاظ، انداز بیان کردہ واقعات، کیسے کیسے حقائق کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں، کیسے کیسے فکر انگیز خیالات دریا کی طرح رواں ہیں، کبھی امت اسلامیہ کی داستان ہے کبھی مسلمانوں کی پستی کا بیان ہے کبھی علماء کی صفات سے محفل پر نور ہے کبھی گاؤں کے کسی واقعہ کی دلچسپ حکایت ہے کبھی خاندان کا کوئی دلکش پہلو زیر بحث ہے کبھی آبا و اجداد کی کہانی ہے، کبھی کسی شخصیت کے بارے میں گہر افشانی اور کبھی ندوہ کا ذکر ہے تو کبھی جامعہ ملیہ کے حالات زیر بحث ہیں۔ غرض مولانا کی خدمت میں رہ کر ایک عجیب عالم نظر آتا۔ مجھے یہ سعادت برسہا برس حاصل رہی کہ مولانا سے بہت قریب رہا اور مسلمانوں کے سربرآوردہ اشخاص علماء اور اداروں کے بارے میں ان کے خیالات سے مستفید ہوا۔ الحمدللہ

میں لکھنؤ میں مولانا کے ساتھ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک رہا۔ ان تین برسوں میں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھا ان کے گھر میں رہتا تھا پھر ادارہ تعلیمات اسلام میں پڑھنے جاتا تھا ساتھ جاتا اور ساتھ ہی لوٹتا۔ مولانا کی زندگی بڑی سادہ تھی اور ہم سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو فرماتے اور اس گفتگو میں بہت سی ایسی معلومات ہم کو حاصل ہو جاتی تھیں جو کسی دوسرے ذرائع سے ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

ایک دن میں مولانا کے ساتھ نئے گاؤں سے ۳۸ امین آباد پارک ادارہ تعلیمات جا رہا تھا، راستے میں ایک سیاہ فام، کلین شیو، گداز بدن، متوسط قد، سر پر انگریزی بال، لکھنوی کرتے اور پیجامہ میں ملبوس ایک صاحب اپنے وسیع مکان کے دروازے پر کھڑے تھے جو اس موڑ پر واقع ہے جو نئے گاؤں میں ڈاکٹر بوس کے مکان کے قریب ہے۔ مولانا نے ان کو سلام کیا اور خیریت پوچھی انہوں نے اُسی احترام سے مولانا کو جواب دیا پھر ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ یہ نیاز فتحپوری تھے۔

اسی دور میں ایک بار ایسا ہوا کہ میں مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کے بڑے صاحبزادے تینوں ساتھ جا رہے تھے کہ ذکر نکلا مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ میں نے سید سلیمان ندوی کہا تو مولانا کو ناگوار ہوا، فرمایا کہ ان کا نام احترام سے لینا چاہیئے۔ اشارہ اس طرف تھا کہ نام کے ساتھ مولانا بھی کہنا چاہیئے تھا۔

سید صاحب کے بارے میں اکثر گفتگو فرماتے اتفاق سے وہ ایک بار لکھنؤ تشریف لائے تو مولانا کی کوششوں سے خود ادارہ تعلیمات اسلام میں جلوہ افروز ہوئے اور انما الاعمال بالنیات پر ایک دلکش

تقریر فرمائی۔ میں نے پہلی بار مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قریب سے دیکھا اور ان کی تقریر سُنی۔ دوبارہ ندوہ کی طالبعلمی میں اس وقت ان کی زیارت سے نگاہیں شاد ہوئیں جب وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے بعد ندوہ تشریف لائے اور دو دن قیام فرمایا، اس وقت بھی ان کی دو تقریریں سننے کا اتفاق ہوا، ادارہ میں تین سال قیام نے مجھے ندوہ کے تمام سربرآوردہ اشخاص سے واقف کرا دیا تھا اور مولانا کی صحبتوں میں ان تمام بزرگوں کے حالات اور ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے اس طالبعلم کا ذہن روشن ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا نے "تعمیر" نام کا ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا۔ یہ اخبار کئی برس نکلتا رہا۔ اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا نام تھا۔ جب پہلا رسالہ نکلا تو اس میں دو بزرگ ہستیوں کے پیام تھے، ایک مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اور دوسرا ڈاکٹر سید عابد حسین کا۔ چونکہ وہ دور جس میں مولانا قدوائی نے یہ رسالہ جاری کیا تھا بڑا نازک تھا، ملک کی تقسیم ہو چکی تھی، فضا کہر آلود تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہم لوگوں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر لکھنؤ میں پناہ لی تھی اور ہر طرف مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ جب لکھنؤ پڑھنے آیا اور مولانا کے ساتھ قیام کیا تو اس وقت بھی مسلمانوں کا مستقبل غبار آلود تھا ہر طرف یاس کا عالم تھا خوف و ہراس طاری تھا۔ مولانا آزاد کی وہ کانفرنس لکھنؤ میں ہو چکی تھی جس میں مولانا نے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ دیں۔ اس کانفرنس کے چرچے عام تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے، رسائل میں اس کا ذکر تھا۔

غرض اس فضا میں مولانا نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے "تعمیر جاری کیا، جس کی اچھی پذیرائی ہوئی اور اس نے جلد ہی دینی و علمی حلقہ میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اس وقت تعمیر کے تبادلے میں ہندوستان اور پاکستان سے بہت سے رسالے آنے لگے اور مجھ کو موقع ملا کہ طرح طرح کے رسالے پڑھوں اور ان سے اپنے دل کی دنیا روشن کروں، چنانچہ ان رسائل میں "صدق"، لکھنؤ، "بصیرت" لاہور، نئی روشنی، جامعہ، معارف، الفرقان، برہان، خاص طور سے یاد ہیں۔ ان کے ذریعہ ایک طرف اعلیٰ زبان سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی اور دوسری طرف ذہن مخصوص اسلامی، ادبی اور علمی سانچے میں ڈھلنے لگا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مولانا کے ایک عظیم کارنامے پر روشنی ڈالوں۔ مولانا قدوائی نے ندوہ میں ایک طویل مدت بحیثیت استاذ گذاری اور حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ بسر کی، اس دور میں مولانا عبدالسلام

قدوائی ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی جیسے مشاہیر اہل علم ایک ساتھ ندوہ میں بحیثیت اساتذہ موجود تھے۔ اسی فضا میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر "الندوہ"، جس کو علامہ شبلی مرحوم نے ندوہ کے علمی ترجمان کی حیثیت سے نکالا تھا اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور "الندوہ"، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں نکلا۔

مولانا قدوائی فرماتے تھے کہ الندوہ کے آخری شماروں میں انہوں نے عربی سکھانے کے اپنے مخصوص طریقہ پر ایک مضمون سپرد قلم کیا جس سے لکھنؤ کے چند اونچے حلقہ کے اصحاب ذوق متاثر ہوئے۔ انہوں نے مولانا سے تعلق پیدا کیا اور عربی پڑھنے کی خواہش کی مولانا نے پڑھانا شروع کر دیا، چونکہ مولانا نے اپنے گاؤں تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں اس طریقۂ تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ ان کے ایک عزیز مرحوم عبدالحی صاحب نے ان سے کہا کہ مجھے قرآن پڑھائیے، مولانا کی سمجھ میں پہلے نہ آیا کہ یہ کام کیسے شروع کریں کہ بغیر قواعد، نحو وصرف کے براہ راست قرآن پڑھانا شروع کر دیں، مگر جب انہوں نے اصرار کیا تو مولانا نے چند ضروری باتیں بتا کر قرآن مجید شروع کرا دیا اور اس میں اُن کو کامیابی ہوئی۔ اس تجربہ کی بنیاد پر انہوں نے "دس سبق" مرتب کئے یعنی دس دن میں عربی کے بنیادی قواعد بتا کر قرآن مجید باقاعدہ معانی کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہی ندوہ میں اسٹرائک ہوئی اور مولانا نے ندوہ کو چھوڑ کر اپنا ایک ادارہ قائم کر لیا جس کا نام رکھا "ادارہ تعلیمات اسلام"، اس کا محل وقوع تھا لکھنؤ کا مرکزی بازار امین آباد پارک ۳۸۔ یہاں مولانا نے کافی عرصہ گذارا تقسیم سے قبل یہ کام شروع کیا اور اس کے بہت سے معاون پیدا ہوتے گئے۔ ادارہ نے بڑی ترقی کی، مولانا کے شاگردوں نے اس میں حصہ لیا اور مولانا کی تحریک پر ادارہ نے کتابیں شائع کرنی شروع کر دیں، ایک مکتبہ قائم ہو گیا اور دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، قرآن مجید کی دوسری کتاب اور قرآن مجید کی تیسری کتاب خود مولانا نے لکھی۔ مولانا کے ایک لائق شاگرد جو خود ادارہ میں آ گئے تھے یعنی مولانا احمد علی کیانی ندوی انہوں نے مولانا قدوائی کی کتابوں کے الفاظ پر مشتمل تین کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب ہے تمرین الدروس حصہ اول جو دس سبق کے الفاظ پر مشتمل ہے، دوسری کتاب ہے تمرین الدروس جلد دوم جو قرآن مجید کی دوسری کتاب پر مبنی ہے اور تمرین الدروس

حصہ سوم قرآن مجید کی تیسری کتاب کے الفاظ سے لکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کی زبان آسان اور موضوعات اسلامیات سے متعلق ہیں جن سے مرحوم مولانا احمد علی کیانی ندوی کی انشا پردازی، ذہانت اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل مولانا عبدالسلام قدوائی کے اندر طلبہ سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لینے کا بڑا عمدہ سلیقہ تھا، اسی فطری صلاحیت سے انہوں نے بعض ایسے حضرات سے بھی کام لے لیا جنھوں نے عمر میں اُس ایک کتاب کے علاوہ کچھ نہیں لکھا جو مولانا نے ان سے لکھوالی تھی۔ عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلہ کی مذکورہ سات کتابوں کے علاوہ مولانا نے احتشام علی رحیم آبادی ندوی سے تین حصوں میں تفہیم الدروس کے نام سے ۳ جلدیں لکھوائیں جو قرآن مجید کی تینوں کتابوں کے حل پر مبنی ہیں۔

مولانا قدوائی نے مولانا عبدالغفار ندوی سے جو درحقیقت ادارہ تعلیمات اسلام میں مولانا قدوائی کے بعد سب سے زیادہ صاحب علم تھے، القصص الشہیرۃ کے نام سے عام و مشہور قصّوں کو عربی میں لکھوا کر شائع کرایا۔ اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دو مختصر کتابیں عام مطالعہ کے لئے "من دون احد" اور "الحنین الی الشہادۃ"، شائع کیں۔

ادارہ سے مولانا قدوائی نے عام اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک ایسا سوانح عمریوں کا سلسلہ شروع کیا جو صحابہ کرام، بزرگانِ دین اور مصلحین امت پر مشتمل تھا اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے شاگردوں سے بہت سی کتابیں لکھوا کر خود نظر ثانی کی اور ان کو ادارہ کی طرف سے شائع کیا۔ بعض وقت فرماتے کہ دیکھو میں نے فلاں صاحب سے یہ کتاب لکھوالی۔ حق یہ ہے بعضوں کا سرمایہ صرف وہ کتاب ہے جو مولانا نے ان سے لکھوالی ورنہ انہوں نے پوری عمر کچھ نہیں لکھا۔

اسی ادارہ سے مولانا نے ایک پندرہ روزہ رسالہ "تعمیر"، کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکالا۔ جس کی بڑی اہمیت ہوئی اور علمی و دینی حلقوں میں وہ مقبول ہوا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس طرح ادارہ نے پورے ہندوستان میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا "تعمیر"، کے علاوہ مولانا نے قرآن مجید اور ریاض الصالحین پڑھانے کا ایک کورس جاری کیا جو تین ماہ کے اندر ایک طالب علم کو اس لائق بنا دیتا تھا کہ وہ عربی اچھی طرح سمجھ سکے چنانچہ میرے سامنے ہی ایک یا دو گروپ ایسے آئے جنھوں نے پورا قرآن تین ماہ میں ختم کر لیا۔ ڈاکٹر رضوان علی ندوی جو اب سعودیہ عربیہ میں معلم ہیں انہوں نے اسی طرز سے تعلیم حاصل کی اور میں نے عربی میں ڈاکٹریٹ کی

ڈگری حاصل کی۔ یہ راقم آثم بھی اسی طرز تعلیم سے مستفیض ہے۔

ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کو بھی مولانا نے ادارہ کے اسٹاف میں شامل کر لیا اور ان کی تربیت کی اور ان سے بہت علمی کام کروائے۔

ادارہ تعلیمات اسلام دراصل لکھنؤ میں قلب شہر میں ایک اہم اسلامی اور تمدنی مرکز بن گیا تھا۔ ادارہ میں ہر ہفتہ ایک بڑا اجتماع ہوتا تھا جس میں قرآن مجید پر تقریر ہوتی تھی۔ یہ درس قرآن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی پابندی سے ہر اتوار کو دیتے تھے ان کی عدم موجودگی میں مولانا عبدالسلام قدوائی درس قرآن دیتے تھے۔ درس سے پہلے اکثر میں دیکھتا کہ مولانا تفسیر ابن کثیر اور تفسیر کبیر رازی کا مطالعہ فرماتے۔ ان جلسوں میں دراصل شہر کے مسلم معاشرہ کا منتخب طبقہ شریک ہوتا تھا خصوصاً سکریٹریٹ کے اونچے آفیسر، وکلاء اور اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ ہر ہفتہ پابندی سے آتا اور جلسہ کے بعد بھی بعض حضرات گھنٹوں مولانا قدوائی سے اسلامی مسائل پر مصروف گفتگو رہتے، خود مجھ کو بھی ان گفتگوؤں سے فائدہ پہونچتا ان بزرگوں میں چند نام ذہن میں رہ گئے، یعنی ظہور الحق صاحب، اقبال علی صاحب ایڈوکیٹ، نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ، فیاض علی صاحب، ابرار احمد صاحب اور اصغر علی صاحب وغیرہ۔

ان بزرگوں کے موضوعات وسیع اور اہم ہوتے تھے خصوصاً موجودہ زمانہ کی مشکلات سے متعلق ایک صاحب نے مولانا قدوائی سے پوچھا کہ لونڈیوں سے حسن سلوک تو ٹھیک ہے مگر ان سے جنسی تعلق کیوں جائز کیا گیا؟ جواب تو مجھے یاد نہیں رہا مگر مولانا نے تسلی بخش جواب دیا۔

تقسیم ہند کا اثر ادارہ پر بہت بُرا پڑا اور بہت سے مخلص مددگار پاکستان چلے گئے، مگر پھر بھی کام چلتا رہا۔ میں ادارہ میں موجود تھا اور مولانا کے حکم سے کبھی کبھی کسی طالب علم کو پڑھاتا بھی تھا اور خود مختارات مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مشکوٰۃ اور شرح وقایہ پڑھتا تھا ادب میں عیون الاخبار مولانا خود پڑھاتے تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے مولانا کو یاد کیا۔ وہ جامعہ گئے۔ ڈاکٹر عابد صاحب نے اصرار کر کے ان کو روک لیا اور ان کی اپیل اپنے پاس رکھ لی اور فرمایا کہ اب آپ کو جامعہ آکر یہاں ناظم دینیات کے عہدے کے علاوہ عربی و اسلامیات کے شعبوں کی صدارت قبول کرنی پڑے گی۔ مولانا واپس تشریف لائے اور بار بار فرماتے کہ معلوم نہیں کہ یہ "ابتلاء" ہے یا "انتظام"۔ اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ ادارے شخصیات سے چلتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ادارہ تعلیمات اسلام مولانا قدوائی کے جامعہ ملیہ جانے کے بعد چند برس قائم رہا مگر اس کی روح اُسی دن

نکل گئی جب مولانا اس کو چھوڑ کر دلی چلے گئے۔ اور پھر وہ ٹوٹ ہی گیا۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہوا اور اب تک ہے۔ مولانا قدوائی نے یہ ایک بڑا اہم اور عظیم کام کیا تھا یعنی انگریزی داں طبقہ کو تھوڑے عرصہ میں عربی پڑھانا اور اُن کو براہ راست قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کے لائق بنا دینا۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے ایک نوجوان جو سکریٹریٹ میں ملازم تھے، لمبے، چوڑے، وجیہ، گورے چٹے مولانا کی خدمت میں آتے اور عربی پڑھتے۔ بعد میں قرآن مجید ختم کر لیا تو ایک دن کچھ عرصہ کے بعد تشریف لائے نہایت گھنی اور بڑی ریش مبارک کے ساتھ۔ دوران گفتگو مولانا نے پوچھا کہ کیا آپ تبلیغ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے کہا بالکل نہیں، پھر پوچھا آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے؟ بولے نہیں۔ تب مولانا نے دریافت کیا کہ یہ تبدیلی کیسے آئی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے قرآن مجید آپ سے پڑھا، حدیثیں پڑھیں، دل پر اثر ہوا، اور میں نے اپنی شکل کو اسلامی بنانا ضروری سمجھا۔ جب وہ چلے گئے تو اس واقعہ کا ذکر مولانا نے ہم لوگوں سے اپنی محفلوں میں بار بار کیا۔ بعد میں کئی حضرات ایسے آئے جن کی زندگیاں مولانا کی نظر کیمیا اثر سے بالکل تبدیل ہو گئیں۔

وہ دلکش محفلیں اکثر یاد آتی ہیں جن میں شام کو عشاء کے بعد مولانا قدوائی، مولانا عبدالغفار ندوی، مشیر الحق صاحب، احتشام علی صاحب جمع ہوتے اور مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔ میں اور مولانا کے بڑے صاحب زادے سالم قدوائی دونوں موجود ہوتے اور بقدر استطاعت ان مجلسوں سے استفادہ کرتے۔

ادارہ میں مولانا کے اثر سے اہل علم برابر آیا کرتے اور ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا مجھے موقع ملتا۔ یہیں میں نے مولانا سید محمد طلحہ حسنی کو دیکھا جو لاہور سے تشریف لائے تھے اور انکی جو کتابیں ادارہ میں رکھی تھیں ان کو وہ لے گئے۔ بعد میں مولانا قدوائی نے فرمایا کہ یہ بڑے صاحب نظر اور ذی علم عالم ہیں، انہوں نے ایک ڈکشنری لکھی تھی عربی اردو، مگر ناشروں نے معاوضہ دے کر حق تصنیف لے لیا اور کتاب پر ان کا نام تک نہیں لکھا۔ فرمایا کہ مولانا طلحہ صاحب کو علم نجوم سے بڑا شغف ہے راتوں کو اٹھ کر ستارے دیکھتے ہیں اور رصد کرتے ہیں۔

مولانا ناظم ندوی کو بھی بار بار ادارہ میں دیکھا اس وقت میں مبادیٔ القراۃ الرشیدۃ پڑھ رہا تھا مولانا ناظم ندوی کی شخصیت سے واقف نہ تھا بعد میں وہ پاکستان چلے گئے اور جامعہ عباسیہ بہاول پور کے مہتمم مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ مدینہ یونیورسٹی میں بھی استاذ رہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگردوں میں ہیں ان کی کتاب

"رحمت عالم" کا عربی میں ترجمہ کیا ہے عربی میں شاعری بھی کرتے ہیں۔ عربی زبان پر ان کی نظر عالمانہ ہے۔
میں نے جس زمانہ میں ان کو دیکھا اس وقت تو کچھ جانتا نہ تھا ۱۱۔۱۲ برس کی عمر تھی محض ذہن میں ایک تصور باقی رہ گیا ہے اور بس البتہ مولانا برابر ادارہ آتے رہتے اور مولانا قدوائی سے گھنٹوں باتیں کرتے، مولانا قدوائی کے دوستوں میں مجیب احمد سہالوی بھی تھے وہ اکثر آتے اور گھنٹوں باتیں کرتے، باتیں سب علمی اور مذہبی ہوتیں۔ مجیب صاحب قومی آواز میں ملازم تھے۔

ادارہ ایک ایسی جگہ تھا جہاں لوگ اطراف واکناف سے آتے رہتے تھے۔ عام اصول یہ تھا کہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک عربی پڑھائی جاتی پھر شام ۴ بجے سے ۷ بجے تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ لوگ آتے رہتے اور اپنے اسباق پڑھ کر چلے جاتے۔ یہ تعلیم فی سبیل اللہ تھی کسی سے مولانا کوئی معاوضہ نہ لیتے۔

میں جس زمانہ میں ادارہ میں تھا اس وقت نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ اور ان کے ساتھ ایک دوسرے ایڈوکیٹ پڑھنے آتے تھے۔ نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ سے بعد میں مجھ سے اچھا تعارف ہوگیا تھا۔ وہ ایک بار انکے گھر بھی گئے۔ وہ کچھ عرصہ تبلیغی جماعت سے متعلق تھے ایک بار تبلیغی جماعت کا ذکر کر کے مسکرا کر کہنے لگے میں نے کلمہ تو اس سے ختم کرادیا چونکہ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ تبلیغی گشت میں مخاطب کو کلمہ سُناتے اور اس سے سُنتے تھے تاکہ اگر کوئی غلط پڑھتا ہو تو اس کی تصحیح ہو جائے۔ وکیل صاحب نے یہ طریقہ ختم کردیا۔ سُنا ہے کہ انہی کی حُسن توجہ سے لکھنؤ کا تبلیغی مرکز بنا ہے۔ بعد میں انہوں نے جماعت اسلامی سے تاثر قبول کر کے وکالت چھوڑ دی۔

اس زمانہ میں کبھی کبھی مولانا کو میں نے سائیکل چلاتے بھی دیکھا ہے سائیکل وہ تیز نہیں چلاتے تھے مگر چلاتے شاذ ونادر ہی تھے، فرماتے تھے کہ سائیکل چلانا آدمی کبھی بھولتا نہیں۔

اس دور میں مولانا علی میاں کا تعلق ادارہ تعلیمات اسلام سے بہت زیادہ تھا یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ علاوہ ہفتہ وار درس دینے کے کبھی کبھی ۹۔۱۰ بجے ادارہ مولانا قدوائی سے ملنے آجاتے۔ مولانا علی میاں کے درس قرآن نے میرے ذہن کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا۔

"تعمیر" نکلا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برابر اس میں لکھتے رہے اور ان کے مضامین کا بڑا اثر پڑا۔ یہ مضامین بعد میں الگ سے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

اس زمانہ میں ہم لوگ "نیا گاؤں" محلہ میں رہتے تھے جو لاٹوش روڈ کے بعد ہے۔ یہ مکان مولانا

قدوائی نے بہت پہلے کرایہ پر لیا تھا، اوسط قسم کا تھا ایک چھوٹا سا کمرہ اوپر بھی تھا۔ اس مکان سے ملحق ایک بڑا مکان تھا جس میں اعجاز صاحب رہتے تھے جو گورنمنٹ سکریٹریٹ میں ملازم تھے، مولانا کے ان سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ہم لوگ اکثر ان کے گھر جاتے اور ان کی بچیاں بھی ہمارے یہاں آتی رہتیں۔ مولانا کے تعلقات تمام پڑوسیوں سے بڑے عمدہ تھے۔ عجب اتفاق تھا کہ ہمارے گھر سے ملا ہوا گھر ایک ریڈیو گویے کا تھا وہ صبح وشام خوب گاتا اس کے بال بچے بھی نہ تھے یار واحباب کا مجمع رہتا اور ہر وقت طرح طرح کے گانے چلتے رہتے مگر مولانا کی زبان سے تین برس میں ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں سنا، کبھی وہ سامنے آجاتا تو مولانا اُس سے گفتگو بھی فرمالیتے اور اس کی خیریت بھی دریافت کر لیتے۔

اس دور میں جب میں لکھنؤ پڑھنے کے لئے حاضر ہوا تو مولانا ماشاء اللہ تندرست تھے البتہ آگے کے چند دانت ٹوٹ گئے تھے مگر انہوں نے لگوایا بھی نہیں تھا۔ بعد میں دانت بنوائے غالباً دہلی جاکر۔ مولانا کی شخصیت میں بھولا پن، خلوص، حسن عمل اور نیک نیتی کا اجالا ہے، وہ جب کسی کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں عمدہ عمدہ خصوصیات کو چُن لیتے ہیں مگر ضمناً کبھی عیوب کا ذکر کر دیتے ہیں۔

مولانا کے پڑوسی اعجاز صاحب مجھ سے بہت خوش رہتے اور کبھی اپنا سودا مجھ سے منگوالیتے اور بولتے کہ یہ لڑکا بڑا عمدہ سامان لاتا ہے، کبھی مولانا مسکرا کر فرماتے کہ اعجاز صاحب تمہاری تعریف کرتے ہیں۔

مولانا کی خوبی یہ ہے کہ ہم بچوں سے وہ ایسی عمدہ اور سنجیدہ باتیں کرتے کہ ایک طرف تو انکی شخصیت سے قربت ہو جاتی دوسری طرف ہماری معلومات میں ان کی صحبت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا۔ میں مولانا کی خدمت میں تین برس لکھنؤ میں اور پانچ برس جامعہ ملیہ دہلی میں رہا اور پھر گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی اکثر ان کی صحبت میسر آجاتی تھی، ظاہر ہے کہ ۸ برس مسلسل ساتھ رہنے بلکہ گرمیوں کے دو ماہ کا عرصہ بھی اگر شامل کر لیا جائے تو دس برس ان کی خدمت میں رہنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ میں نے اس طویل مدت میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے ان کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز میری نگاہوں میں ہیں۔ مولانا کو میں نے کبھی غصہ میں نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی اپنا توازن واعتدال نہیں کھویا، اعزہ واحباب سے تعلق استوار کرنے کی برابر کوشش میں رہتے ان کا انداز نظر درحقیقت اس شعر کی سراپا تصویر تھا، ع

تو برائے وصل کردن آمدی ⁂ نے برائے فصل کردن آمدی

مجھے یہاں چند واقعات یاد آرہے ہیں جن کا بیان اس موقع پر مولانا قدوائی کی عظمت، تحمل، اور حسن سلوک کا غماز ہے۔

مولانا کے بڑے صاحبزادے کو گاؤں میں ایک شریر لڑکے نے ایک دھار دار کنکر سے مار دیا جس سے ان کے کان کی لو کٹ گئی مگر مولانا نے اس لڑکے کے والد سے نہ کوئی شکایت کی اور نہ کسی قسم کا غم وغصہ کا اظہار فرمایا صرف گاؤں کے ایک جراح کو بلوا کر کان میں ٹانکے لگوا دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا معمولی واقعہ تو نہ تھا کہ آدمی خاموش ہو جائے، مگر میں نے مولانا کے برتاؤ میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ پایا اگرچہ اس لڑکے کے والد پشیمان تھے مگر مولانا کا برتاؤ ان کے ساتھ اور بھی محبت بھرا تھا۔

گاؤں میں ایک صاحب ذرا تیز مزاج تھے ان سے کسی سے بنتی نہیں تھی۔ مولانا کی بیگم پر وہ کسی غیر معقول بات پر ناخوش ہو گئے اور بُری طرح اُن کو گالیاں دیں آنا جانا چھوڑ دیا اور قطع تعلق کر لیا مگر مولانا کا یہ حال کہ جب وہ تھولینڈی تشریف لاتے تو اکثر پہلے انہی صاحب کے یہاں جاتے اور ان سے ایسا حُسن سلوک کرتے کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ مولانا کے گھر والوں سے ان کے تعلق اس قدر خراب ہیں۔ کبھی کبھی بیگم صاحبہ فرماتیں کہ جو لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں اُن سے مولانا کا حُسن سلوک اور بڑھ جاتا ہے۔

گاؤں میں ایک قانون گو آئے ہوئے تھے مولانا دلّی میں تھے ان کے بعض اعزّہ نے مولانا کا مکان انکو دے دیا اور وہ اس میں ان کی اطلاع کے بغیر رہنے لگے، جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو ان کو ناگواری ہوئی۔ انہوں نے مکان خالی کرانے کے لئے لکھا مگر وہ کسی طرح خالی نہ کیا گیا آخر مولانا اور ان کے بال بچے بھی پہونچ گئے تب بھی قانون گو صاحب نے مکان خالی نہ کیا، اس پر مولانا کو بڑی ناگواری ہوئی اور پھر یوپی حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار کو لکھ دیا، انہوں نے قانون گو سے کہہ دیا اور مکان خالی ہو گیا مگر جب مولانا تشریف لائے تو قانون گو سے بڑے خلوص سے ملے اور کسی قسم کی ناخوشگواری کا احساس بھی باقی نہ رہا۔

میں نے جو خاص بات محسوس کی وہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں دوسروں پر احسان کر کے جتانے کی عادت نہیں بلکہ وہ عمداً اپنے احسانات کے ذکر کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا ذکر ٹال جاتے تھے۔

مولانا کا خاندان "بھیارے" ضلع بارہ بنکی سے تھولینڈی آیا تھا جہاں اس کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ قدوائی خاندان دراصل ضلع بارہ بنکی سے تعلق رکھتا ہے حضرت شاہ قدوۃ الدین کی نسبت سے یہ قدوائی خاندان کہلاتا

ہے جن کی قبر کہتے ہیں کہ اجودھیا میں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ حسینی سید ہیں، بعد میں جاگیر رہن ہو گئی، اور مولانا کو جائیداد کا بہت تھوڑا حصہ پہونچا۔ مولانا کے دادا غضنفر علی قدوائی نے اپنے نام سے تھولینڈی سے ملحق ایک گاؤں بسایا تھا جو آج بھی غضنفر کھیڑا کہلاتا ہے۔

مولانا کے والد عبدالرؤف صاحب کو میں نے دیکھا ہے۔ ۹۰ برس سے زیادہ عمر پائی کئی نسلوں سے بس اولاد کا سلسلہ ایک ایک بیٹے سے چل رہا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علم وعمل کی نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا۔ ماشاء اللہ مولانا نے سات بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

بچوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم دلائی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کو بچوں کو جامعہ میں تعلیم دلانے کا شوق تھا، اتفاق بھی ایسا ہوا کہ ان کو ملازمت بھی وہیں مل گئی۔

مولانا نے تعلیم پہلے اپنے گاؤں میں پھر بچھراواں ضلع رائے بریلی میں مڈل تک حاصل کی پھر لکھنؤ تشریف لے گئے۔ حضرت علیا بیگم صاحبہ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ مولانا جب ندوہ میں پڑھنے گئے تو داخلہ ہوسٹل میں نہ ملا ایک مسجد میں قیام فرمایا۔

مسجدوں میں بیت الخلاء تو ہوتا نہیں وہاں رہتے ندوہ میں پڑھتے مگر یہ مشکل بڑی پریشان کن تھی پھر کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے، گرمیوں کے دن، سارے جسم پر سُرخ دانے پڑ گئے۔ اس زمانہ میں میرے نانا مرحوم سید محمد حسین اور میرے بابا مرحوم سید اصغر حسین دونوں صاحبان پولیس میں کانسٹبل تھے وہ ان کے یہاں گئے اور تعلیم کے لئے رہنے کی خواہش کی نانا نے جواب دیا کہ وہ قلیل تنخواہ پاتے ہیں خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ بابا مرحوم کی اہلیہ یعنی میری بڑی اماں نے مجھ سے بتایا کہ وہ بہت کم کھانا کھاتے تھے میرے یہاں ایک بار آئے تھے۔

غرض بعد میں ندوہ میں داخلہ ہو گیا تو یہ مشکل حل ہو گئی مگر کافی دنوں شہر میں رہ کر مولانا نے تکلیفیں برداشت کیں۔ یہاں جو اتفاق ہوا وہ یہ کہ میرے نانا نے ان کو اپنے گھر میں نہ رکھا مگر ان کے نواسے یعنی راقم آثم کو مولانا نے آٹھ برس اپنے پاس رکھ کر علم کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچا دیا۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مولانا پھول کی طرح پالے گئے تھے اور شبنم کی طرح نازک تھے کہ چودہ[۱۴] بچوں میں وہ تنہا زندہ رہے باقی تیرہ[۱۳] بھائیوں کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا، لہٰذا والدین کی آنکھ کا تارا تھے اور لاڈ پیار اور ناز ونعمت اور ہر قسم کی سہولت ان کے لئے میسّر تھی۔ گاؤں والے کہتے ہیں کہ مولانا بچپن میں

تیز اور بڑے متحرک تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہانت کی دلیل ہے۔ چنانچہ باشعور ہو کر نہایت نیک سیرت اور صاحب علم بنے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنی والدہ کا دودھ کبھی نہیں پیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ تیرہ بھائی مر چکے تھے۔ والدین کو وہم ہو گیا کہ ماں کے دودھ میں شاید کوئی خرابی ہو لہذا گاؤں میں متعدد عورتوں کے دودھ پر پلے۔ ایک قصائی محلہ کی عورت کا دودھ مولانا نے پیا تھا چنانچہ مولانا کی رضاعی بہن اس رشتہ سے آکر ان کے یہاں قیام کرتیں اور مولانا نے باوجود اتنے غیر معمولی فرق کے کبھی ان سے بے توجہی کا برتاؤ نہ کیا ہمیشہ خلوص سے ملتے اور وہ جب تک چاہتیں مولانا کے یہاں رہتیں۔

ادارہ کے قیام کے زمانہ میں مولانا نے آموں کا ایک باغ لگوایا۔ یہ دس بیگھے کا باغ بہت دلکش ہے۔ خوب آم پھلتے ہیں۔ مولانا لوگوں کو دل کھول کر بانٹتے اور کھلاتے تھے۔ جب میں آموں کی فصل میں جاتا روز آم بڑی محبت سے کھلاتے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ مولانا کی عادت یہ بھی تھی کہ کوئی نیا آدمی عزیزوں میں سے آئے یا کوئی جاننے والا آجائے فوراً اس کی دعوت کر دیتے۔

مولانا کی بیگم صاحبہ بھی بڑی محنت کش ہیں وہ کبھی کام کرنے سے اکتاتی نہیں ہیں باوجود ایک بڑے خاندان کی ذمہ داریوں کے برابر ان کے یہاں مہمانوں کا جمگھٹا رہتا ہے لوگ آتے ہیں، آم کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

مولانا کی کتاب زندگی کا سب سے روشن ورق وہ ہے جو ان کی عظمت کے مینار کو بلند اور ان کے خلوص کی چاندنی کو وسعت عطا کرتا ہے یعنی مولانا کا اپنے گھر کو دارالطلبہ بنانا، مولانا ہمیشہ اپنے گاؤں اور خاندان اور محلہ میں سے ضرورتمند لڑکوں کو اپنے گھر میں رکھ کر پڑھاتے رہے ہیں یہ سلسلہ ندوہ کی ملازمت سے لے کر جامعہ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے تک قائم رہا، اس عرصہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل لوگوں کو اپنے پاس رکھا اور ان کی تربیت کی اور اکثر کو بام عروج تک پہونچایا۔

پروفیسر مشیر الحق، احتشام احمد (یہی راقم آثم) عبدالحفیظ قدوائی، عرفان شبلی، سجاد علی احتشام علی رحیم آبادی (جامعہ میں ساتھ رہے)۔

اور بھی کئی طلبہ نے دو سال چار سال مولانا کے ساتھ قیام کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا کو ۱۹۵۴ء میں جب میں جامعہ گیا تو درحقیقت لکچرر کی تنخواہ ملتی تھی اور وہ اسی تنخواہ میں اپنے سات بیٹے دو بیٹیوں کی

پرورش کے علاوہ ضرورت مند طلبہ کو اسی سے فیض پہونچاتے تھے۔

مولانا گاؤں والوں کی بھی مدد کرتے تھے، چنانچہ گاؤں میں ایک مشہور حافظ قرآن تھے ان کا نام تو لیاقت علی تھا مگر معروف تھے حافظ کلو کے نام سے۔ حافظ صاحب بڑے دلچسپ بزرگ تھے وہ مولانا کے بھی استاذ رہ چکے تھے اور انہوں نے کئی نسلوں کو تعلیم دی تھی عمر بھی اللہ کے فضل سے ۹۰ برس کی پائی۔ گاؤں کے اسکول میں ملازم تھے مگر جب ضعیفی زیادہ بڑھی تو کام کرنے سے معذور ہو گئے اس وقت مولانا نے ان کے نام ایک مختصر سی رقم جاری کر دی اور وہ ان کو انتقال تک ملتی رہی۔

مولانا کے ہم عمر لوگوں میں تھولینڈی میں ہمارے ایک عزیز تھے جو مرزا پور میں جا کر بس گئے تھے، شروع میں ان کے دن بڑے اچھے تھے اور بڑی فیاضی سے انہوں نے خاندان والوں اور متوسلین کو نوازا مگر پھر کاروبار بیٹھ گیا اور بیچارے کا تنہائی میں بڑی کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ ان کے بچے بہت پریشان ہیں تو ایک رقم ان کے لئے باندھ دی جو کئی برس تک ان کو ملتی رہی۔

قرض کے بارے میں مولانا کا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا وہ کہتے تھے کہ قرض اتنا ہی دینا چاہیئے جتنا واپس نہ ملے تو کوئی غم نہ ہو اور اپنا کام نہ رکے، چنانچہ ایک بار ان کے ایک قریبی عزیز نے دو سو روپے قرض مانگے . . . . مولانا کی بیگم صاحبہ چاہتی تھیں کہ قرض دیدیا جائے مگر مولانا کے پاس پیسے نہ تھے چنانچہ مولانا نے اُن عزیز کو لکھا کہ ۲۵ روپے حاضر ہیں اس سے زیادہ کی گنجائش میرے پاس نظر نہیں آتی۔

مولانا فرماتے تھے کہ روپیے پیسے کے معاملات سے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں، اگر آدمی کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے پیسے کسی پر زیادہ خرچ ہو رہے ہیں مگر دوسرا فریق اس پر اتنے نہیں خرچ کرتا تو رفتہ رفتہ دل پر غبار آجاتا ہے۔ مولانا معاملات کو صاف رکھتے تھے اور پیسوں کے معاملات میں محتاط رہتے تھے، ہمارے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا اکثر ساتھ سفر کرتے بعد میں پوچھ لیتے تھے کہ اگر کچھ باقی ہو تو بتا دینا۔

مولانا ان علماء میں سے تھے جو ندوہ کے مقاصد کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ڈاکٹر سید محمود بہار کے وزیر تعلیم تھے اس وقت انہوں نے ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کو لکھا کہ آپ ایک ایسا نصاب تیار کروائیے جو جدید و قدیم کا حامل ہو میں اس کو یہاں حکومت سے تسلیم کروا دوں گا۔ چنانچہ نصاب تیار ہوا مگر اس دوران وزارت میں کچھ انقلاب آیا اور معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ مولانا قدوائی اکثر افسوس کرتے اور

فرماتے اگر اس وقت یہ مسئلہ تکمیل کو پہونچ گیا ہوتا تو ندوہ کا اصل خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔

وہ اس بات کی بار بار شکایت کرتے کہ ندوہ کے جلسوں کو روک دیا گیا، مولانا کو یہ بہت ناگوار تھا وہ ندوہ کے جلسوں کا ذکر جوش وخروش سے فرماتے اور تمنا کرتے کہ وہ جلسے دوبارہ شروع ہو جائیں۔ سالانہ جلسے تو نہ ہو سکے مگر ۸۵ سال کی ندوہ نے برسی منائی اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ منعقد کیا جس میں بڑا دلکش اجتماع ہوا اور عرب بڑی تعداد میں جلسہ میں حاضر ہوئے۔

مولانا نے ایک محفل میں طویل مضمون ندوہ کے مقاصد پر پڑھا جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ اور ندوہ کے مقاصد کا ماحصل ہے۔

مولانا کو قرآن سے بڑا شغف تھا اکثر وہ درس قرآن دیتے اور تفسیر بیان کرتے اپنے گاؤں تھولینڈی ہوتے تو وہاں بھی صبح کو تفسیر بیان کرتے۔ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں غالباً دو بار پورے قرآن کے مطالب گھسیاری منڈی نیا گاؤں کے قریب والی مسجد میں بیان کئے۔ مولانا کا ایک مخصوص طریقۂ تفسیر تھا وہ محض وضاحت کرتے تھے نہ تفصیل میں جاتے اور نہ زیادہ اختصار کرتے۔ گاؤں میں بھی وہ تفسیر بیان فرماتے اور تسلسل سے نہیں بلکہ کبھی کوئی سورت لے لی اور کبھی کوئی دوسری۔ مگر مجھے یاد ہے کہ مولانا نے ایک بار پورے پارۂ عم کی تفسیر بیان فرمائی اور ترتیب وار چند دنوں میں والناس تک تفسیر بیان کی۔ اس وقت مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ آخری سورتوں میں الفاظ بہت سخت ہیں مگر مولانا کو سب یاد تھے اور ان کے معانی ومطالب پر پوری قدرت حاصل تھی پہلے وہ الفاظ کی تشریح فرماتے پھر معانی بیان کرتے۔ اس طرح کبھی کبھی ایک آدھ عربی شعر بھی بطور حوالہ پیش کر دیتے اور اس کی تشریح فرماتے۔ دراصل ادارہ میں درس قرآن کی مواظبت کے باعث ان کو قرآن مجید کے مطالب پر اور تفاسیر کے مطالعہ کے باعث اس کی آیات کی تاویلات پر اچھا ملکہ تھا۔ قرآن مجید پر مطالب وتشریح کے ساتھ مولانا نے تین پاروں کی تفسیر لکھی تاکہ عربی پڑھنے والے ان سے نفع اٹھائیں، ان کے نام بھی قرآن مجید کی پہلی کتاب، دوسری کتاب اور تیسری کتاب رکھا۔ ان کے بعد جب "تعمیر" نکلا تب اس میں مستقل تفسیر قرآن کے لئے دوسرا صفحہ مخصوص تھا۔ اس طرح مولانا نے ۶ پاروں کی تفسیر مکمل کر دی۔ فرماتے کہ ایک صاحب جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر پر سخت اعتراضات کئے تھے جب انہوں نے (مولانا قدوائی کی) تفسیر دیکھی تو بڑی تعریف کی جس سے

مجھے محسوس ہوا کہ مولانا کو اس کی جانب سے اطمینان تھا، مگر اس تفسیر کو مکمل کرنے کے لئے جو لگن اور فرصت درکار ہے وہ مولانا کو حاصل نہیں اس لئے بظاہر یہ تفسیر بس انہیں چھ پاروں تک محدود رہ جائیگی پھر اس کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو ایک نفع بخش کام ہو جائے گا۔

مولانا کو علم حدیث سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے مولانا شاہ حلیم عطا کے مشورہ پر ایک کتاب احادیث نبویؐ کے اولین صحیفے کے عنوان سے . . . . . مرتب کی تھی جو اپنے موضوع اور تحقیق کے لحاظ سے ممتاز ہے اور جو ان معاندین اسلام کو دنداں شکن جواب ہے جو یہ تصور رکھتے ہیں کہ تمام احادیث عصر عباسی میں جمع کی گئیں۔ اس سے قبل آنحضرتؐ کے زمانہ میں احادیث نبویؐ کے جمع کرنے کا کام مطلق نہیں ہوا۔ مولانا نے ان تمام صحابیوں کے نام اور ان کے مجموعۂ احادیث کا نام گنوایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ بہت سے مجموعے خود آنحضرتؐ کی زندگی میں مرتب ہو گئے تھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کتاب عربی میں منتقل کر دی جائے تو اس کی اہمیت اور عظمت عربوں تک پہونچ سکے۔ اردو میں لکھنے کے باعث موضوع کا دامن ہندوستان تک محدود رہتا ہے۔

زندہ حقیقت

مذہب ایک زندہ حقیقت ہوتا اور مسلمان اسلام کی روشنی لے کر آگے بڑھتے اور زندگی کی شب تاریک سحر کر دیتے اور ان کے فیض سے دنیا کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آجاتی، مرجھائے ہوئے پھول لہلہا اٹھتے، گل ولالہ پر نکھار آجاتا، سبزۂ پامال ہوا کی موجوں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگتا اور یہ عالم پیر پھر نئے سرے سے جوان ہو جاتا۔ تہذیب وتمدن کو نئی آب وتاب نصیب ہوتی، سیاست نئی کروٹ لیتی، معیشت کے پیچ وخم دور ہوتے، معاشرت ایک نیا رنگ اختیار کرتی اور انسانیت کا درماندۂ راہ قافلہ اسلام کی روشنی میں خیر وفلاح کی منزل کی طرف بڑھتا۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

مولانا عبدالسلام قدوائیؒ

کے خطبات کا ایک اجمالی جائزہ

مولانا بدرالدین صاحب
لکچرار عربی وناظم دینیات جامعہ ملیہ دہلی

اگر شعلہ بیانی اور پرتاثیر خطابت نے علماء ہند کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہرؒ مولانا آزاد سبحانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے علماء کو حیات جاوداں عطا کی ہے تو اب مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کو بھی اس صف میں شامل کر دیجئے کہ ان کے خطبات نے بھی ہزاروں پتھر دلوں کو موم کر کے اسلامی فکر سے بہرہ ور ہونے کے مواقع فراہم کئے۔

اگر ایک طرف ناقدر شناسانِ مذہب ان کی تقریروں کے طفیل دینی مزاج سے روشناس ہوئے تو دوسری طرف بے جان قلوب کو ان کے کلمات نے سرگرم مچلتی ہوئی روح دے کر ایک حیات متحرکہ کا تحفہ عطا کیا۔

ان کی تقریروں میں نہ جانے کیا جادو تھا، کیا شیرینی اور تاثیر تھی کہ نمازی گردن اٹھا اٹھا کر انکی آمد کا انتظار کیا کرتے، جب وہ تشریف لے آتے تو خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور کبھی کسی مجبوری سے نہ آتے تو مایوسی کا اظہار کیا جاتا، وہ خطبہ کیا ہوتا تھا، قرآنی آیات، احادیث اور سلف صالحین کے مستند واقعات سے گندھا ہوا ایک گلدستہ، ایسا گلدستہ جس کے گلہائے رنگا رنگ اگر ایک طرف تاریخ کے طالب علم کے لئے تسکین ذوق فراہم کرتے تو دوسری طرف تصوف کا شیدائی بھی اس میں اپنے لئے غذا تلاش کر لیتا۔

جہاں ایک عالم اس خطبہ کے رمز و کنایات، تشبیہات و اشارات سے بہت سی علمی گتھیاں سلجھاتا چلتا وہاں ایک ان پڑھ بھی اس کے سیدھے سچے واقعات کو اپنے لئے رہنما پاتا۔

اگرچہ مولانا مرحوم کے یہ خطبات مواد کے اعتبار سے اپنے جلو میں معاشرتی مذہبی اور سیاسی ہر طرح کے مسائل لئے ہوتے تھے، لیکن روحِ مذہب ان پر حاوی اور غالب ہوتی۔ آئیے اس مجلس میں ان خطبات پر ذرا تفصیلی نظر ڈالیں۔

جامعہ میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا، طلباء کی آمد آمد ہے، داخلے ہو رہے ہیں، گویا کام کا آغاز ہے، اس زمانہ میں مولانا جمعہ کے خطبہ کے لئے نیک نیتی کا عنوان منتخب فرماتے اور تقریر انما الاعمال بالنیات سے شروع ہوتی، اس حدیث کے بعد مربوط واقعات سے طلباء کو یہ تاثر دیا جاتا کہ حصول علم کا آغاز نیک نیتی سے ہونا چاہئے، صرف کمانے اور پیٹ پالنے کے لئے نہیں۔ علم برائے علم اور حصول علم دین کی نیت ہو تو ہر قدم پر رضاء الٰہی شامل حال ہوگی جو مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد ہے اور روزی تو ہر حال میں حاصل ہو جائے گی۔

سالانہ امتحان میں مولانا کا خطبہ روزِ جزاء اور حساب کتاب کے عنوان پر ہوتا جو صحیح معنی میں موقع محل کے لحاظ سے ایک مربوط درس ہوتا تھا۔ موضوع کے صحیح انتخاب کے بعد مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عنوان کے تمام پہلوؤں کو خلط ملط کر کے الجھاتے نہ تھے بلکہ موضوع کے صرف ایسے نکتے کو لے کر چلتے جو عنوان کی جان ہوتا اور سامعین کے دل و دماغ کو اس کی حقانیت قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ کر دیتا۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عرس کے زمانہ میں ان کے خطبہ کا موضوع یہی ہوتا مگر عام روش سے ہٹا ہوا۔

عام طور پر لوگ بزرگانِ دین سے متعلق تقریروں میں ان کے تاریخی واقعات یا کشف و کرامات کے قصے سناتے ہیں، جیسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا باؤلی بنوانے کا قصہ، جب وہ اپنی خانقاہ میں باؤلی بنوا رہے تھے، اس زمانہ میں غیاث الدین تغلق بادشاہ نے ناراضگی کی وجہ سے مزدوروں کو یہاں آنے سے روک دیا، محبوب الٰہیؒ کو معلوم ہوا تو انھوں نے مزدوروں کو رات میں بلوا کر کام لینا شروع کر دیا، بادشاہ نے چراغوں کے لیے تیل کا حصول ناممکن کر دیا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے چراغوں میں تیل کے بجائے پانی جلوایا اور کام ہوتا رہا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس کرامت پر مسلمان تو یقین کر سکتے ہیں مگر کسی مادہ پرست، یا غیر مذہبی آدمی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حضرت مولانا مرحوم محبوب الٰہیؒ کے ذکر کو ایسے نکتہ

سے شروع کرتے جس پر موجودہ مشاہدہ خود شاہد اور دلیل بن سکے۔

مولانا کا خطبہ اس آیت سے شروع ہوتا۔

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

اولیاء اللہ پر نہ کسی طرح کا خوف ہوتا ہے نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوتے ہیں۔

آپنے دیکھا ہوگا، یہاں جامعہ نگر سے تین چار میل دور آج کل بہت بھیڑ بھاڑ ہے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا عرس ہو رہا ہے لوگ دور دور سے آرہے ہیں، دہلی والے انھیں سلطان جی کے نام سے یاد کرتے ہیں ادب کی وجہ سے نام نہیں لیتے، تاریخ تو نہیں بتاتی کہ محبوب الٰہیؒ کبھی سلطان الہند رہے ہوں ہاں اس کے برعکس اکبر اعظم کو ضرور پورے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا موقع ملا مگر کبھی کوئی اس کو سلطان الہند کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ نہ کوئی اس کے مزار پر فاتحہ اور عرس کے لئے آتا ہے۔

اس طرح ماہ محرم میں مولانا مرحوم حضرت امام حسینؓ پر خطبہ دیتے تو ان کی مشہور و معروف داستان مظالم نہ سناتے، بلکہ حضرت امام کے کردار کے اس نکتہ پر زور دیتے کہ یزید کی شخصیت ان کے نزدیک خلافت کے منصب کے لائق نہ تھی، لہذا انھوں نے حق کی خاطر آواز بلند کی، اور ظاہری وسائل کی کمی نیز حکمراں جماعت کی شدید مخالفت کے باوجود اس حد تک عملی قدم اٹھایا کہ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا اور رہتی دنیا تک کے لئے ایک مثال قائم کر دی۔

عید الاضحیٰ کے مہینہ میں مولانا ہر جمعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق خطبہ دیتے، مختلف آیات اور احادیث کی تشریح ہوتی مگر خاص طور پر لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم مولانا کی توجیہ کا مرکز ہوتا۔

مولانا زور دے کر بار بار فرماتے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہرگز نہ تو قربانی کا گوشت پہنچتا ہے نہ اس کا خون، بلکہ خدا تک رسائی تو قربانی کرنے والے کے جذبہ اور خلوص کی ہوتی ہے، اگر نیت خالص ہے اس میں کسی طرح کی ریاکاری کو دخل نہیں، تو قبولیت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

مولانا کے خطبات کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مشکل سے مشکل موضوع کو ایسی مثالوں سے

واضح کرتے کہ کوئی الجھن ہی باقی نہ رہتی۔

مثال کے طور پر زہد و تقویٰ ہی کو لے لیجئے یہ مسلمان کی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ متقی ہونا بڑا مشکل کام ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں، جو شخص مکمل صورت و سیرت عمل و کردار سے قرآن و سیرت رسول کا نمونہ ہو وہی متقی ہو سکتا ہے، ظاہر ہے اس مفہوم کی روشنی میں متقیوں کی فہرست بہت محدود رہ جاتی ہے، کیونکہ عام آدمی خود کو ان تمام صفات کے ساتھ متصف کرنے سے قاصر سمجھتا ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے تقویٰ کے اہم مسئلہ پر مولانا کا خطبہ

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اے ایمان والو تم اللہ سے ڈرو ایسا ڈرنا جو فی الحقیقت ڈرنا ہے اور دنیا سے اس حال میں جاؤ کہ اسلام پر ثابت قدم ہو۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی مکمل تقویٰ لیکن سوال یہ ہے کہ تقویٰ کیا ہے اس سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت عمر نے حضرت ابی بن کعب سے سوال کیا کہ تقویٰ کیا ہے پہلے انھوں نے کچھ تامل کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر خود واقف ہیں، جب ان کا اصرار ہوا تو فرمانے لگے امیر المومنین کیا آپ کبھی جنگل میں کسی دشوار گزار راستے سے گزرے ہیں جو بہت پتلا ہو اور اس کے دونوں طرف کانٹے لگے ہوں فرمایا ہاں گزرا ہوں کہنے لگے کیسے، حضرت عمر نے فرمایا اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہوا، بچاتا ہوا گزرا ہوں، حضرت ابیؓ نے کہا بس اسی کا نام تقویٰ ہے کہ دنیا کے مسائل سے نمٹتا ہوا اس طرح دامن بچا کر گزر جائے کہ گناہوں کے خار اس کے دامن سے نہ چمٹ جائیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کا کارندہ کسی شہر سے آیا، رات کے وقت شہر کے حالات سناتا رہا، جب ملکی حالات سنا چکا اور حضرت عمر کے ذاتی حالات یعنی خیر و عافیت پوچھنے لگا تو خلیفہ نے حکومت کا چراغ گل کر دیا کیونکہ اب ذاتی گفتگو ہو رہی تھی اس میں حکومت کا چراغ جلنا جائز نہ تھا۔

میرے خیال میں مولانا کی ان دو مثالوں کے ذریعہ تقویٰ کی جو تشریح سامنے آئی ہے اس سے مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے، اس روشنی میں ایک معمولی دکاندار، بس کا کنڈیکٹر اور دفتر کا کلرک

بھی چاہے تو اپنے منصب پر مامور رہتے ہوئے متقی کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

روزہ کے فلسفہ اور فضائل پر آپ نے بہت سی تقریریں سُنی ہوں گی، اس موضوع پر بھی مولانا کا انداز انفرادیت رکھتا ہے

آپ کا معمول تھا رمضان کے پہلے جمعہ کو ذیل کی آیت تلاوت کر کے تقریر فرماتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے مگر روزہ اصل میں اس لئے نہیں کہ بھوکا رہنے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے یا خاص طور پر صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے بلکہ یہ تو گناہوں سے بچنے کے لئے مشق کرانے کا طریقہ ہے، جس طرح گھوڑا سواری سیکھنے میں پہلے گھوڑے کی ننگی کمر پر سواری کرائی جاتی ہے، تاکہ اس تکلیف کے ساتھ بیٹھنے کی مشق ہو جائے تو پھر زین وغیرہ کے ساتھ سواری کرنے میں بھی کوئی زحمت نہ ہو بلکہ آرام محسوس ہو، اس طرح روزہ میں اللہ تعالیٰ تمام جائز چیزوں سے پرہیز کراتے ہیں تاکہ آئندہ ناجائز کاموں سے تو پرہیز کرنے کا عادی ہو جائے جو روزہ کا اصل مقصد ہے۔

اب ایک خاص حادثہ سے متعلق مولانا کا خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے بیت المقدس پر اور نہر سوئیز پر قبضہ کیا تو عالم اسلام میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، ہر شخص مغموم و متفکر نظر آتا تھا مگر اس موقع پر بھی سنجیدہ ذہن یہ سمجھتے تھے کہ ظلم کچھ بھی ہوا ہو اس کا حل صرف یہ نہیں ہے کہ ہاتھ اٹھا کر اسرائیل کو بددعائیں دیتے رہو یا امریکہ پر تبرا پڑھتے رہو بلکہ مرض کا اصل سبب دور کرنے کی ضرورت ہے، مولانا مرحوم بھی اس حادثہ سے متاثر تھے، اور کئی ماہ ان کے خطبوں سے اس کا اثر عیاں ہوتا رہا مگر ان کے خطبوں سے نہ تو آہ و بکا ظاہر ہوتی تھی نہ صرف دشمن پر نکتہ چینی، بلکہ ان کی نگاہ اصل مرض پر تھی جس کی نشاندہی وہ اس طرح کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔

یہ آیت مسلمانوں کے ایسے دور میں نازل ہوئی جبکہ اسلام کا بالکل ابتدائی دور تھا اور اس وقت کے مسلمان بقول قرآن کریم ایسے تھے کأنھم بنیان مرصوص، لیکن اس کے باوجود باری تعالیٰ نے انھیں ان الفاظ کے ساتھ نصیحت فرمائی اور کہا کہ آپس میں جھگڑا فساد نہ پیدا کرو، اس سے تمھاری طاقت بھی ختم ہو جائے گی اور تمھاری ساکھ اکھڑ جائے گی۔

تو درحقیقت مسلمان جب تک اس بات کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی گزارتے رہے، ان کی ساکھ بھی بنی رہی، طاقت بھی نہ ٹوٹی۔

مٹھی بھر مسلمانوں کی تعداد ہزاروں مسلح فوجوں کے مقابلہ میں فتح و کامرانی حاصل کرتی رہی اس لئے کہ وہ جو کام بھی کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے، اس کے اصولوں کی روشنی میں کرتے تھے لہذا کامیابی قدم چومتی تھی۔ بعض جنگوں میں کافروں نے مسلمان فوجوں کے نیزوں اور تیروں کو چرخے کے تکلوں سے تعبیر کر کے طعنے دیئے ہیں کہ یہ ان تکلوں سے جنگ لڑیں گے مگر وہ جانباز اسلامی سپاہی انہیں تکلوں سے بڑی بڑی فوجوں کا منھ موڑ دیتے تھے۔

یہ رسول خدا کی تعلیم اور اسلام کا اثر تھا کہ جو اسلام کے دشمن سرزمین عرب سے مسلمانوں کی بیخ و بنیاد مٹانے کا ارادہ رکھتے تھے، انھوں نے ہی مسلمان ہو کر اسلام کے نام پر اپنے جان و مال نثار کر دیئے۔

حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل کا مشہور قول ہے جو جنگ یرموک میں فرماتے تھے کہ میں جب تمام جنگوں میں رسول اللہؐ کے مقابلہ میں لڑتا رہا ہوں تو آج ان کافروں کے سامنے سے کیسے منہ موڑ لوں گا، یہ سب آنحضرت کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ تھا جس نے ان لوگوں کو اس منزل پر لا کھڑا کیا تھا، کافروں کے متعلق قرآن کریم نے کہا تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتّٰی کہ ان کے قلوب یکجا نہیں ہیں، اگرچہ تم ان کو ایک جماعت خیال کرتے ہو اور مسلمانوں میں اسلامی جذبہ کارفرما ہونے کی وجہ سے اس کے برعکس حال تھا، وہ ہمیشہ ایک خیال ایک جان رہے۔

مگر آج اس کے برخلاف مسلمانوں کی حالت ہے کہ ان کو بظاہر ایک جماعت دیکھا جاتا ہے مگر ان کے قلوب ایک دوسرے کی طرف سے کدورت اور بغض سے بھرپور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا شیرازہ منتشر ہے، جماعت اور قوم کا کوئی وزن نہیں شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔

اس زمانہ میں مسلمان درجنوں اور پھر سیکڑوں کی تعداد میں تھے مگر ہزاروں اور لاکھوں پر بھاری تھے، قادسیہ وغیرہ کے معرکے اس کے شاہد ہیں۔

آج مسلمان مراقش سے جاکرتا تک کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہیں مگر ان پر وہ قومیں حاوی ہیں جو چند لاکھ کی تعداد میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری کامیابی کا جو امتیاز تھا وہ باقی نہیں رہا، اب ہم میں نہ توحید پرستی کی قوت ہے نہ وحدت اور ایکتا کی طاقت جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

اس کے بعد ایک مسئلہ رہ جاتا ہے، اردو خطبات کے بارے میں مولانا کا فقہی مسلک اور عمل۔

میں نے اس سلسلہ میں مولانا سے وضاحت چاہی تو فرمایا "بھائی، حنفیہ کے نزدیک تو غیر عربی زبان میں خطبہ مکروہ ہے مگر میں نے عوام کے فائدہ کے پیش نظر اس کراہت کو ہلکا کر لیا ہے۔ میں پہلے خطبہ میں بھی اول آخر عربی کی عبارت پڑھتا ہوں درمیان میں بھی آیات واحادیث کے ٹکڑے آتے رہتے ہیں۔ دوسرا خطبہ مکمل عربی میں ہوتا ہے۔

اور یہ میں نے اس لئے کیا کہ لوگ لمبی چوڑی تقریریں پسند نہیں کرتے، جمعہ کی نماز میں بھی پہلے سے نہیں آتے تو خطبہ ہی میں کوئی بات ان کے کان میں پڑ جائے، اسی لئے میں خطبہ بہت مختصر رکھتا ہوں، کسی جماعت یا فرد پر تنقید نہیں کرتا، کسی کا نام نہیں لیتا، اسی لئے لوگ راغب ہوتے ہیں"۔ اس کے بعد موضوعات کے لحاظ سے ہم مولانا کے خطبات کی تین تقسیمیں کر سکتے ہیں۔

۱۔ مستقل موضوعات۔

۲۔ غیر مستقل واقعاتی یا حادثاتی۔

۳۔ عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔

پہلے نمبر کے موضوعات میں نماز، رمضان المبارک، ختم قرآن مجید، عید الفطر، عید الاضحیٰ، عشرۂ محرم، سیرۃ النبیؐ، شب برات، حضرت نظام الدینؒ اور خواجہ اجمیریؒ کے عرس کی تقریبات، تعلیمی سشن کے آغاز میں نیک نیتی پر اور سالانہ امتحان کے زمانہ میں قیامت اور روز جزاء پر۔

دوسرے نمبر کے خطبات میں خطبۂ نکاح، کسی لیڈر کی موت، عالمی یا ملکی حالات اور حادثات جامعہ نگر کی زندگی میں انفرادی یا اجتماعی تنازعات، کسی خصوصی مہمان کی آمد وغیرہ۔

تیسرے نمبر کے خطبہ میں، عقیدۂ توحید، اسلام، ایمان کامل، احسان، حسن ظن، ایثار، جبن کی مذمت، برائی پر صبر، انفاق فی سبیل اللہ، نبی کی شفقت، موت کا تصور، تخلقوا باخلاق اللہ، تزکیۂ نفس، اخلاق کریمانہ، تضحیک کی مذمت، بزرگوں کی عزت، دنیا کی بے ثباتی، حلال وحرام روزی، تقویٰ اور حقوق العباد۔

مندرجہ بالا خطبات مولانا کی حیات میں قلم بند کر لئے گئے تھے، اب ان کی ترتیب وتدوین کا کام زیر تکمیل ہے۔

روشن ضمیری

ندوہ کے بانیوں کی روشن ضمیری محتاج ثبوت نہیں رہی۔ ہر چند کہ قدیم وجدید کی آمیزش اور عقل ونقل کا امتزاج اس اعلیٰ معیار کے مطابق نہ ہو سکا جو ندوہ کے کارکنوں کے پیش نظر تھا مگر محدود تجربہ نے بھی مقصد کی صداقت عیاں کر دی اور اس کے فرزندوں کی عملی مثال نے دوسرے رہ نوردوں کے لئے راہ عمل نمایاں کر دی، فکر ونظر کے گوشے ہوں یا تحریر وتقریر کے میدان، تصنیف وتالیف کے ادارے ہوں یا درس وتدریس کی مسندیں، جلوت کے ہنگامے ہوں یا خلوت کے حلقے، اخبارات ورسائل کے مقالے ہوں یا ذکر وشغل کے مشغلے، سیاست کی پُرخار وادیاں ہوں یا معیشت کی پرپیچ راہیں، ادب کے گیسوؤں کی آرائش ہو یا علم وحکمت کی غواصی، کون سا کام منتسبین ندوہ کے نام سے خالی ہے۔ کس میدان میں اس کے فیض یافتوں کے قدم نہیں پہونچے، کون سی وادی ان رہ نوردان شوق سے ناآشنا ہے اور ان کے نقش پا کی شوخی کس منزل پر پکار پکار کر یہ اعلان نہیں کر رہی کہ ؎

"ابھی گذرا ہے کوئی اس طرف سے"

(مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

اور اُن کی تالیفات

محمود الازہار ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ فرزندانِ ندوہ کے اس حلقہ سے تعلق رکھتے تھے جن پر ندوہ کو ناز وفخر ہی نہیں تھا بلکہ وہ ندوی فکر وتخیل کے پوری طرح علمبردار ونمونہ تھے، مولانا کی تعلیم وتربیت خالص ندوی طرز فکر اور ماحول میں ہوئی، ان کے جلیل القدر اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حیدر حسن خان کا نام نامی لیا جاسکتا ہے جن سے ان کو حد سے زیادہ لگاؤ اور محبت تھی. مولانا سادہ لوح اور خوش طبع اور خاموش کام کرنے والے انسان تھے اور یہ خوبیاں ان کی تعلیمی وتدریسی زندگی، رسالہ الندوہ کی ادارت، ادارہ تعلیمات اسلام کا قیام، درس قرآن، پھر رسالہ تعمیر کا اجرا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں صدر شعبہ دینیات اور آخر میں ندوہ میں معتمد تعلیمی اور دارالمصنفین میں شاہ معین الدین ندوی کے انتقال کے بعد نظامت، ان سب میں جلوہ گر نظر آتی ہیں، وہ جہاں بھی گئے اور جس حال میں رہے اپنی ملنساری کو باقی رکھا اور شگفتہ بیانی کی وجہ سے مقبول ومحبوب رہے اور مختلف طریقوں سے تشنگان علوم کی پیاس بجھاتے رہے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ تدریس میں گزرا اور تصنیف وتالیف کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں تھی، اسی وجہ سے بہت کم لکھا لیکن وہ بہت کم بھی کچھ ایسا کم نہیں۔

مولانا نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور اکثر چیزیں ان کی تجرباتی زندگی کی دین تھی جو بعد میں افادہ عام کی خاطر زیور طبع سے آراستہ ہو کر آگئیں۔ یہاں پر ہم ان کی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کی پہلی کتاب (۲) قرآن مجید کی دوسری کتاب (۳) قرآن مجید کی تیسری کتاب

مولانا ندوہ سے جب الگ ہوئے تو احباب اور کچھ اصحاب خیر کے تعاون سے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم

کیا اور درس قرآن دینے لگے۔ اس درس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت رہتی تھی۔ ان کے سامنے قرآنی زبان (عربی) جو مشکل ترین زبان بنا کر پیش کی گئی تھی آسان اور ممکن الحصول بنا کر پیش کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس میں مولانا کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی اور عربی زبان کے دس سبق بہت مقبول اور مفید ثابت ہوئی، پھر مولانا نے غیر عربی داں حضرات کے لیے جو قرآن مجید کے معانی اور کسی حد تک تشریح و تفسیر کو بھی پڑھ لیں۔ مذکورہ بالا تینوں رسائل مرتب کئے۔ اس کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں۔ ترجموں کا حجاب دائرہ اثر کو بہت کم کر دیتا ہے. متکلم کے الفاظ کی تاثیر مترجم کے کلام میں تلاش کرنا بے سود ہے، کیونکہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بلیغ لفظوں اور پر زور فقروں کے اثر کو اپنی زبان میں منتقل کر سکے۔ ترجموں میں عبارت کی روانی، بیان کا زور اور فصاحت وبلاغت جس سے پڑھنے والے وجد میں آجائیں پیدا کرنی بہت دشوار ہے، اہل زبان کے لیے جو زبان تیر ونشتر کا کام دیتی ہے اسے دوسرے محسوس نہیں کرتے، اس لیے ضرورت ہے کہ عربی زبان کو حاصل کر کے اسی کے ذریعہ براہ راست قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا جاسکے، مگر عام طور پر لوگ اس جانب توجہ اس لئے نہیں کرتے کہ ان کے خیال میں عربی زبان اس قدر مشکل ہے کہ برسہا برس کی محنت و جدوجہد کے بعد بھی اتنی استعداد نہیں پیدا ہو سکتی کہ قرآن مجید یا احادیث کا مطالعہ کیا جاسکے، لیکن جیسا کہ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں، یہ خیال صحیح نہیں زیادہ سے زیادہ دس دن میں اتنی استعداد پیدا ہو سکتی ہے کہ آسانی سے اصل عربی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا جاسکتا ہے اور اگر روزانہ ایک دو گھنٹے بھی کام کیا جائے، تو چھ مہینے میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ ضروری تفسیر وتشریح کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے اصل عربی عبارت کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دے دیا ہے اور اخلاقی مضامین سے صرف نظر حکایات اور آسان تر اخلاقی قصے دیئے ہیں تاکہ ترجمہ میں قیاسی مدد ملے۔

مولانا نے اس کو اسی طور پر مرتب کیا کہ اگر کوئی شخص اس کے ذریعہ عربی زبان پڑھ کر حدیث شریف تفسیر فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابیں کم از کم سمجھ سکے، اور اگر کوئی اپنا مطالعہ صرف قرآن مجید ہی تک محدود رکھنا چاہتا ہے تو اس کو صاف دل سے مشورہ دیا ہے کہ وہ عربی زبان کے دس سبق کے بعد اس کتاب کو بلا چوں وچرا شروع کر سکتا ہے اور ایسے قرآن مجید کے معانی ومطالب کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

۲۔ عربی زبان کے دس سبق :

یہ کتاب مولانا کے اس کورس کا نتیجہ ہے جو انھوں نے غیر عربی داں تعلیم یافتہ طبقہ کو ڈاک کے ذریعہ عربی کی تعلیم کے لئے شروع کی تھی۔ مگر وقت اور ڈاک کے مصارف سے اجتناب کرتے ہوئے اس کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا، تاکہ اس سے استفادہ عام ہو سکے۔

یہ کتاب عربی زبان کے صرف دس اسباق پر مشتمل ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں روزمرہ کی چیزیں اور قواعد کا مختصر تعارف بھی ہے تاکہ اگر کوئی اس کتاب کے بعد قرآن کا ترجمہ و تفسیر تھوڑا بہت پڑھنا چاہے تو اس کو قرآن مجید کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب پڑھ کر قرآن کے معانی و مطالب کسی حد تک سمجھ میں آ جائیں ان اسباق میں دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کا اظہار مولانا نے اس کتاب کے مقدمہ میں کر دیا ہے۔

(۱) قرآن مجید کے ابتدائی الفاظ سے واقفیت ہو جائے، دوسرے روزمرہ کے عربی الفاظ سے تعارف ہو جائے اس کے لئے عربی سے اردو اور اردو سے عربی کے جملے جمع کر دیئے گئے ہیں جس سے روزمرہ کی بات چیت میں سہولت ہو، نیز اس کتاب میں دیئے گئے قواعد میں اصطلاحات سے گریز کیا گیا ہے۔

یہ کتاب جدید غیر عربی داں طبقہ میں بے حد مقبول ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے مدارس میں افادیت اور اختصار و جامعیت کے سبب داخل نصاب بھی ہے۔

ہندوستان کی کہانی :

مختصر تاریخ ہند، قدیم ہندوستان، مسلمانوں کی آمد سے قبل اور بعد کے واقعات پھر ہندوستان کے جن سیاسی حالات میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی، اس کا تذکرہ محمد بن قاسم کا داخلہ، غزنوی اور غوری کی آمد پھر ہندوستان میں خود مختار غلام حکومت کا قیام، خلجیوں اور تغلق خاندان کے عروج و زوال کی کہانی، افغان پٹھانوں کے کارنامے مغل حکمرانوں کے پر شکوہ دور کا تذکرہ اور انگریزوں کی غلامی سے لے کر آزاد ہندوستان تک تقسیم ملک سے لے کر آج کے دور تک کی تاریخ کو آسان زبان میں ابتدائی مدرسوں کے بچوں کے لئے پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب مفید اور پر از معلومات ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں نکلا تھا اور اب تک اس کے دس سے زائد ایڈیشن طبع ہو کر ختم ہو چکے ہیں، اور اس اردو کشی کے دور میں بھی اس کی افادیت

اور اس سے استفادہ برقرار ہے۔

دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد :

یہ مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کو مولانا نے درس و تدریس سے وقت نکال کر رسائل و اخبارات کے لئے مختلف موضوعات پر لکھے۔ اور اس کو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ یہ "دنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے" "مصلح اعظم" "بنیادی عقیدہ" "انسانیت کی فصل بہار" جیسے اہم عناوین پر مشتمل ہے۔

حدیث نبوی کے اولین صحیفے :

اس میں حدیث کے ان صحیفوں کا تذکرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں مرتب ہوئے۔ یہ "الندوہ" کے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اسی کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا، اسکو لکھنے کے اسباب کی طرف مولانا نے خود اشارہ کیا ہے۔ مخالفین اسلام نے ذخیرہ احادیث کو غیر معتمد اور غیر معتبر ٹھہرانے کی جو ناپاک سازشی مہم چلا رکھی تھی کہ یہ ذخیرہ دو ڈھائی سو سال تک یوں ہی بیان کیا جاتا رہا اور قرن اول و ثانی تک کتابت کا نظام نہیں تھا، بلکہ تیسری صدی ہجری میں کتابت کا دور شروع ہوا، مولانا نے اس سازش کو سامنے رکھ کر یہ مضمون تحریر فرمایا اور اس میں اپنے استاذ گرامی مولانا حیدر حسن خاں مرحوم سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء سے استفادہ فرمایا:

اس کتابچہ میں مولانا نے حدیث کی ضرورت، آنحضرتؐ کی توجہ، کتابت حدیث کی اجازت، عہد رسالت کی تحریری کوشش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے املا۔ عہد صحابہ کی تحریری جدوجہد، صحابہ کرام کے مرتب کردہ حدیث کے مجموعے حضرت عبداللہ ابن عباس کی تصنیفات، حضرت ابوہریرہ کی کتابیں، حضرت عبداللہ بن عمر کی روایات کی کتابیں حضرت جابر کے صحیفے، حضرت عائشہ کے تحریری مجموعے، حضرت ابو سعید خدری کی روایات، مکثر بن صحابہ کی تصانیف حضرت عبداللہ بن مسعود کی تصنیفات، حضرت زید بن ثابت کی مرویات دوسرے اہم صحابہ کی کتابیں جیسے عناوین کے تحت تحریر فرمایا ہے، جس میں کتابت حدیث رسول اکرمؐ کے عہد مبارک میں مل جاتی ہے۔

مثالی حکمراں:

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے، شاہی نہیں

"ضروری دردیں ماخدمت گریست" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں مولانا کا تحریر کردہ مضمون الفرقان میں شائع ہوا، اس کے بعد رسالہ "تعمیر" لکھنؤ میں کئی مہینہ تک ان مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔

ان مضامین کو پیش کرنے کی غرض خود مولانا نے مقدمہ میں تحریر فرمائی ہیں۔ "خوش قسمتی سے کاروان رفتہ کے نقوش اب بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہیں، ایک عرصہ سے جی چاہتا تھا کہ ان نقوش کو اوراق تاریخ سے نکال منظر عام پر لایا جائے اور ساتویں صدی کے جمہوری نظام سے بیسویں صدی کے جمہور کو باخبر کیا جائے۔

بعد میں دوستوں کے اصرار پر مولانا نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کے تمام واقعات اصل مآخذ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، مؤطا امام مالک، جامع ترمذی، دارمی مستدرک، طبقات ابن سعد، کامل ابن اثیر، تاریخ طبری، اصابہ، اسد الغابہ، استیعاب، کنز العمال، کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، ازالۃ الخفاء شاہ ولی اللہ، فتوح البلدان، بلاذری سے لئے گئے ہیں اور غور کر کے ان کی صحت کا اطمینان کر لیا گیا ہے، اس کتاب کا شمار مکتبہ تعلیمات اسلام کی اہم کتابوں میں ہے۔

ہماری بادشاہی:

یہ کتاب چھوٹے بچوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اس کی عبارت سادہ، طرز ادا سہل اور الفاظ چن چن کر آسان رکھے گئے ہیں اور زبان ایسی اختیار کی گئی ہے جو ان کے لئے دلچسپ اور پسندیدہ ہو اور واقعات میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ یاد کر سکیں اور موقع سے ان کی قومی نخوت اور مذہبی غیرت کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ تاریخ سے استفادہ کر سکیں۔

اس میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ پیش کی گئی، جو گزشتہ صدیوں میں روئے زمین کے اطراف میں انھوں نے قائم کیں، اگرچہ اس میں تمام سلطنتوں کا استقصا

نہیں کیا گیا ہے، تاہم کوئی بڑی سلطنت چھوٹنے نہیں پائی ہے، یعنی آغاز اسلام سے لے کر عرب، مصر و شام، عراق و ایران، ترکستان و افغانستان، ہندستان و روم، اندلس کی پوری اسلامی تاریخ کو مختصراً پیش کیا گیا ہے، اور بعد کے واقعات جیسے تقسیم ہند (قیام پاکستان) ایران، افغانستان کا تعارف، مصر میں بادشاہت کا خاتمہ سعودیہ میں آل سعود کی حکومت کا قیام عراق کی آزادی، اردن و شام اور یمن کا مختصر تذکرہ سوڈان صومالیہ اور لیبیا کی آزادی سے لے کر تیونس، الجزائر کی آزادی نائیجیریا، جمہوریہ مالی، کویت، لبنان، بحرین قطر، مسقط، عمان و زنجبار، انڈونیشیا، ملیشیا کی آزادی تک کے واقعات کا ذکر مختصراً کیا ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۵ھ میں نکلا تھا اور زمانہ کی تبدیلیوں کے لحاظ سے اس میں اخیر کے ابواب میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ کتاب مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

حیدر حسن خاں:

مولانا نے اپنے استاد محترم جن سے ان کا قلبی لگاؤ تھا، احباب کے بار بار اصرار پر، اپنے خیالات کو قلم بند کیا، اس سے مولانا کے خاندانی حالات ابتدائی تعلیم و تربیت اور حصول تعلیم کے لئے لاہور کا سفر اور وہاں کا قیام، زمانہ تدریس اور ٹونک کے مدارس کا تذکرہ، سفر حج اور اصحاب ثروت سے اعراض تدریس کی شہرت اور ندوہ میں بہ حیثیت شیخ الحدیث آمد، امام ابو حنیفہ سے غیر معمولی عقیدت و محبت نیز طریقہ درس اور اپنے چھوٹوں سے برتاؤ، غریب نوازی، مہمان نوازی، رواداری، شاگردوں کا خیال جدید مسائل سے دلچسپی، ندوہ سے استعفا اور اولاد و شاگرد سب کا ذکر خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔

مولانا خود اس کتاب کی ترتیب پر رقمطراز ہیں:۔

"علمائے سلف کے حالات کتابوں میں بہت پڑھے ہیں، ایسے چند ہی بزرگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کے اندر علم و عمل کا کمال نظر آیا۔ مولانا حیدر حسن رحمۃ اللہ علیہ انہی صاحب کمال بزرگوں میں تھے جن کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور کئی برس تک خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، جس قدر ان کے حالات سے واقفیت ہوئی اسی قدر عقیدت میں اضافہ ہوا، ان کا علمی تبحر، اُن کا زہد و تقویٰ، اُن کا ذوقِ عبادت، اُن کا شوقِ خدمت، اُن کا حسنِ اخلاق، انکی انکساری، انکی

بے نفسی، ان کی بے نیازی، ان کی انسان دوستی، ان کا بزرگوں کا ادب، ان کی دوستوں پر نوازش ان کی خوردوں پر شفقت، ان کی عالی ظرفی، ان کی بلند ہمتی، ان کی فیاضی، ان کا حسن سلوک، انکی بے خوفی، ان کی حق گوئی، ان کا استغنا، ان کا توکل، ان کا امیروں سے احتراز، ان کا غریبوں کا خیال محتاجوں کی حاجت روائی، تنگ دستوں کی دست گیری، کس کس بات کو یاد کیا جائے، ان کا خیال کرتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

امید ہے کہ اہل علم کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھی جائیں گی، ممکن ہے مولانا کے واقعاتِ زندگی کسی کو متاثر کریں اور ان کے اخلاق عالیہ کو معیار عمل بنانے کی رغبت ہو۔

میزان و منشعب جدید :

یہ مجموعہ "میزان" اور منشعب جدید" دو کتابوں پر مشتمل ہے، اس میں عربی زبان کے قواعد کو سہل اور آسان طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، اس میں قواعد کے اجراء کے لئے تمرینات کا بھی سہارا لیا گیا ہے، تاکہ طالب علموں کے ذہن میں قواعد عربیہ جاگزیں ہو جائیں، اس کی اردو بہت آسان رکھی گئی ہے، پہلے یہ دونوں کتابیں الگ الگ تھیں مگر بعد میں طباعت کی سہولت کی خاطر یکجا کر دی گئیں۔

ندوۃ العلماء کے پچاسی سال

ماضی کی مختصر سرگزشت، حال کا جائزہ، مستقبل کا خاکہ

اس رپورٹ کو مولانا نے اجلاس تعلیمی منعقدہ ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس میں قیام ندوۃ العلماء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کی مختصر تاریخ آگئی ہے، قیام ندوۃ العلماء کے وجوہات اس کا بنیادی تخیل، اغراض و مقاصد اور تحریک ندوۃ العلماء کے مختلف ادوار اور ان اہم شخصیتوں کا تعارف آگیا ہے جنھوں نے . . . . اپنے خون جگر سے اس چمن کو سینچا، نیز اس میں فرزندان ندوہ کی علمی و فکری

و تعمیری کاوشوں کا خلاصہ بھی آگیا ہے، اور اس میدان میں طلبہ کا ذہن بنانے کے لئے جو اسباب ندوہ نے مہیا کئے ہیں ان کو بھی رپورٹ میں شامل کیا گیا ہے، ندوہ کی عربی و اردو صحافت اور فرزندان ندوہ کی نتیجہ خیز علمی و دینی سرگرمیوں کا تعارف مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ندوہ کی مختصر مگر جامع تاریخ مولانا کے ہاتھوں مرتب ہو کر ہمارے علمی ذخیرہ میں ایک نئے اضافہ کا سبب بنی ہے۔

طریقۂ کار

ندوہ کے کام کا یہ طریقہ تھا کہ عہدہ دار مجلس انتظامی کے مشورہ سے کام کرتے رہتے تھے سال بھر کے بعد عام جلسہ کسی مشہور مقام پر ہوتا تھا اس کے لئے کوئی نامور صاحب علم صدر منتخب ہوتا وہ ایک پر اثر خطبہ پڑھتا جس میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے، ناظم سالانہ کارگذاری کی رپورٹ سناتا پھر مشہور مقرروں کی تقریریں ہوتیں جن میں عربی مدارس کے منتظمین کو آمادہ کیا جاتا کہ نئے حالات اور جدید ضروریات کے پیش نظر وہ نصاب تعلیم اور طریقۂ درس میں تبدیلی کریں لیکن صدیوں کے رائج شدہ نصاب کو بدلنا آسان نہیں تھا، طبیعتیں اس سے مانوس تھیں، اور ان کتابوں سے ایک خاص قسم کی محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی، اس لئے جلسوں کا اثر دیرپا نہ ہوتا۔ لوگ مصلحین کے خیالات کی زبان سے تائید کرتے مگر عمل کی راہ میں قدم نہ رکھتے وہی غالب کے شعر کا معاملہ تھا کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

فتنۂ انکارِ حدیث اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی خدمات

سید محمد ظفر ندوی

حقیقت کسی رنگ و روپ میں ہو وہ عموماً سادہ ہی ہوا کرتی ہے اور شاعر کے کہنے کے مطابق ع
سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے۔" قیامت کا کام کر جاتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ سادگی پسند ہوتے ہوئے بھی الفاظ اور اسلوب کی حد تک ظاہری رنگ و روپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کچھ اور ہی ذوق کے تھے، ہر معاملہ میں حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی سادہ، تحریر لفظی صناعی سے دور لیکن مؤثر، وضع قطع تکلفات سے پاک غرض ان کی ہر چیز سادہ تھی، کسی موضوع پر لکھتے ہوئے وہ ایسا انداز اختیار کرتے کہ ان کی بات دل پر احساس ہوئے بغیر اثر کر جاتی تھی۔ فتنۂ انکار حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ سادہ تحریر میں لکھا اور مؤثر لکھا۔ ان کی اس سلسلہ میں دوسری خصوصیت یہ رہی کہ ردانکار حدیث میں انھوں نے مثبت انداز اختیار کیا، واقعات و حالات اور عقل و نقل کی اس انداز سے تطبیق دی جس کو منکرین حدیث بھی (اگر انھوں نے ان کی تحریر پڑھی ہو) مان لیں۔

ہندوستان میں آج سے تقریباً پچاس سال پہلے پنجاب کی زرخیز زمین سے ایک نئے فرقہ کا ظہور ہوا۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا تھا، مولوی احمد الدین اس فرقہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ قلیل مدت کے بعد پورا ملک اس فتنہ کی زد میں آگیا۔ عبداللہ چکڑالوی، ڈاکٹر برق جیلانی (جو بعد کو تائب ہو گئے) اور ان کے مشیر کار بلکہ ایک طرح سے راہنما نیاز فتحپوری، اور ان سے متاثر ہو کر ڈاکٹر پرویز اور ڈاکٹر عبدالودود اور دوسرے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے انکار حدیث کو زور و شور سے چلایا کہ وہ باقاعدہ ایک مسلک و مشرب بنتا نظر آنے لگا حافظ اسلم جیراجپوری کسی سے پیچھے کیوں رہتے، انھوں نے آگے بڑھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی معجزات کا انکار کیا اور غیر متواتر حدیثوں کو ظنی قرار دیا۔ اس مسلک نے قرآن کی نئی تفسیر پیش کی۔

چونکہ یہ سب جدید طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے فطری طور پر مسلمانوں کے جدید طبقہ میں ان کی اور

ان کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی اور صدیوں کا مسلمہ اصول (اقرار حجیت حدیث) مشکوک اور غیر معتبر قرار دیا جانے لگا، اس فتنہ کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے علماء امت نے قابل قدر اور قابل فخر کوششیں کیں، اور بڑی حد تک اس پر قابو بھی پالیا لیکن اگر غائرانہ نظر سے دیکھا جائے تو شاید مثبت اقدام کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کو ہر بات کی توفیق ہو۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم عموماً ہر معاملہ کے مثبت پہلو کو تلاش کرتے اور اس راہ سے اصلاح وانقلاب کی بساط بھر کوشش کرتے تھے۔ انکار حدیث کے فتنہ کا جب انھوں نے تجزیہ کیا تو وہ سمجھ گئے کہ صحیح قرآن خوانی تو اس امت میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے لیکن صحیح قرآن فہمی کا ذوق ظاہر بینی اور انحطاط و زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ قرآن فہمی کے ذوق صحیح کو عام کرنے کے لئے انھوں نے ۱۹۴۸ء میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی رفاقت و مساعدت سے ستمبر ۱۹۴۸ء میں پندرہ روزہ دینی رسالہ "تعمیر" نکالنا شروع کیا۔ اس ادارہ کے مقاصد میں اگرچہ انھوں نے بصراحت اس امر کا اظہار نہیں کیا کہ اس سے ان کا مقصد انکار حدیث کا رد و ابطال ہے۔ لیکن ممکن ہے ان کے پیش نظر یہ مصلحت کارفرما ہو کہ اخفاء، اظہار کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مبتلائے وہم و تشکیک کو احساس بھی نہ ہوتا تھا اور وہ محض قرآن کی تفسیر سمجھ کر یا کسی دینی موضوع پر تفصیلی روشنی سمجھ کر "تعمیر" کا مطالعہ کرتا تھا اور غیر شعوری طور پر اس کے رجحانات و خیالات میں رخنہ پڑ جاتا تھا۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے اس تریاق نے کتنوں کا مرض دور کیا ہوگا، اور انھیں احساس بھی نہ ہوا ہوگا۔ تعمیر کے سیدھے سادھے مضامین غضب کا کام کر جاتے تھے۔

دوسری طرف انھوں نے شہر لکھنؤ میں درس قرآن اور درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا، یہ درس ہر جمعہ کو بعد مغرب ہوتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:-

> "قرآن شریف کے درس میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں تک پہونچنے لگی حتی کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا اور اس کا انتظام عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا اس وقت اس درس اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کے دن بعد مغرب کسی اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحب ذوق انگریزی داں کو تلاش کرنا ہو تو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔"

میرے نزدیک یہ درس قرآن اور درس حدیث فتنہ انکار حدیث کا ثبت علاج تھا، اس کا اندازہ ان تفسیری نوٹس سے بخوبی ہوتا ہے جو رسالہ "تعمیر" میں انھوں نے تحریر کئے ہیں۔ اصلاح افکار و خیالات کا انھوں نے اس سے بڑا زبردست کام لیا ہے، اور ان قرآنی اشاروں کو واضح کرنے کی مؤثر کوشش کی ہے جو منصب نبوت اور اس کے عالی مقام کو متعین کرتے ہیں۔

منکرین حدیث نے قرآن سے استدلال میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور جس بے راہ روی کا وہ شکار ہوئے ہیں ان سے اہل نظر خوب واقف ہیں۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان لغزشوں کے اصل سبب کو تاک کر عربی زبان وادب کو سیکھنے اور عربی دانی کے بعد قرآن فہمی کا ذوق عام کرنے کے لئے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کی کتاب "عربی کے دس سبق" (جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی اور متعدد اسکولس اور کالجس میں داخل نصاب ہوئی) اور تمرین الدروس (۱-۲-۳) اور قرآن مجید کی پہلی دوسری تیسری کتاب انکار حدیث کو جڑ سے ختم کرنے کی بڑی عمدہ کوششیں ہیں۔ ان کتابوں اور ان درسوں نے جدید طبقہ پر گہرا اثر ڈالا اور جو لوگ اس سنہری سلسلہ سے منسلک ہوئے وہ بغیر کسی بڑی جدوجہد کے صرف کئے، انکار حدیث کے فتنہ سے محفوظ و مامون رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے والوں، کالجوں میں پڑھنے والوں اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں (ادارۂ تعلیمات اسلام) عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی کا شوق پیدا ہوا اور بہت سے لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے لگیں، مولانا کی محبت واخلاق اور سادگی و تواضع نے ان کو گرویدہ کیا اور یہ ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے کا ذریعہ بنے۔

منکرین حدیث کے نزدیک رسول کی حیثیت قاصد یا پیغام رساں یا مبلغ کی سی ہے، پیغام رسانی کے بعد نہ اس کے ذمہ کوئی اور فریضہ باقی رہتا ہے اور نہ ہی جن لوگوں تک وہ پیغام پہنچا ہے، ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ رسول کو "پیغام رساں" سے زیادہ اہمیت دیں، لکھنے والوں نے اس نظریہ کے باطل ہونے پر بہت کچھ لکھا لیکن ساری تحریریں صاف صاف اس بات کی غماز ہوتی ہیں کہ وہ منکر حدیث کو جواب دے رہی ہیں۔ اور افہام وتفہیم اور صلاح واصلاح مقصود نہیں ہے بلکہ ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

کا اظہار مقصود ہے۔ مولانا قدوائی مرحوم نے اپنی تحریر میں منکرین کے اعتراض کا بصراحت ذکر نہیں کیا کہ جواب سا معلوم ہونے لگے بلکہ طرز نگارش ایسا اختیار کیا جس سے محض حقیقت بینی اور حقیقت بیانی معلوم ہو اور انکار حدیث کے زہر کا تریاق بھی حاصل ہو جائے۔ نمونہ کے طور پر بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تعمیر ۱۵/اپریل ۵۰ء مطابق ۲۶ جمادی الاخر ۱۳۶۹ھ کے اداریہ میں "لائق توجہ" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"آپ پیغام الٰہی کے حامل تھے۔ آپ پر سب سے پہلے وحی الٰہی منکشف ہوئی تھی اور آپ ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی سے دنیا کو آگاہی ہوئی، اس لئے آپ احکام الٰہی کا صحیح مطلب سمجھتے تھے مرضی الٰہی سے بخوبی واقف تھے اور منشاء ربانی کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ارشادات سے بخوبی اطلاع ہو، آپ کے حالات سے واقفیت ہو، آپ کی سیرت کے ایک ایک پہلو پر نظر ہو، آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کا علم ہو، اس کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے حالات، عمل اور طرز زندگی سے بھی واقف ہونا ضروری ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے جنھیں صاحب قرآن کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل تھی۔ جس طرح سیرت نبوی سے الگ ہو کر قرآنی احکام کو سمجھنا دشوار ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے حالات زندگی سے بے خبر رہ کر منشائے نبوت کو سمجھنا مشکل ہے، ایسا کرنے پر قدم قدم پر غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا اندیشہ ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جن لوگوں نے اس کی کوشش کی وہ کج روی اور گمراہی میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پھر کبھی اس سے نہ نکل سکے۔"

ایک دوسرے مضمون میں رقمطراز ہیں:۔

"عام قاعدہ ہے کہ کسی پیغام کو پورے طریقہ سے سمجھانا مقصود ہوتا ہے اور صاحب پیغام کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شخص کے پاس پیغام بھیجا جا رہا ہے اسے مطلب سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو اس کے مطابق عمل کرنے میں کوئی دشواری ہو تو پیغام کسی معتبر شخص کی معرفت بھیجا جاتا ہے اور اسے پیغام کے مضمرات سے پورا باخبر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی پوری توضیح کر سکے اور کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی چاہتا تھا کہ جو پیغام وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے بھیج رہا ہے اس کے سمجھنے میں لوگوں کو دشواری نہ ہو اور نہ اس پر عمل کرنے میں کوئی الجھن ہو اس لئے اس نے خالی کتاب بھیجنے کے بجائے یہ کیا کہ ایک بہت ہی معتبر ذات کو پیغامبری کے لئے منتخب کیا

اور اس کے ذریعہ اپنی ہدایات سے لوگوں کو مطلع کیا، اس نے نبی کو صرف آیات الٰہی سنانے پر مامور نہیں کیا بلکہ تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب اور تزکیۂ نفوس کی ذمہ داری بھی سپرد کی ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔

یہ اور ان کی ہم شبیہ تحریروں کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ ان کی اس سادہ بیانی نے غیر شعوری طور پر کتنے لوگوں کے ذہن و دماغ اور فکر و نظر کو بدل ڈالا ہوگا اور جو لوگ انکار حدیث کے فتنہ سے پہلے سے دور تھے، ان کے قلب و نظر کو بغیر کسی بڑی مشقت اور جد و جہد کے حقیقت آشنا اور صحیح اسلامی فکر کا مالک بنا دیا ہوگا، حق تو یہ ہے کہ جو فطری اثر سادگی میں ہے وہ بناوٹی زیب و زینت میں عنقا ہوتا ہے، عربی شاعر متنبی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

حسن الحضارۃ مجلوب بتطریۃ
وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

(تہذیب و تمدن کا حسن کسبی اور مصنوعی ہوتا ہے اور دیہاتی حسن وہبی اور فطری ہوتا ہے۔)

منکرین حدیث نے سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ غیر متواتر حدیثیں ظنی ہیں کیونکہ ان کی قطعیت کا کوئی واضح اور ٹھوس ثبوت تاریخ اسلام میں نہیں ملتا، یہ مفروضہ ایک دوسرے مفروضہ پر قائم ہے وہ یہ کہ دو ڈھائی سو برس تک حدیثیں یوں ہی بیان ہوتی رہیں اور تیسری صدی ہجری میں کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا قدوائی مرحوم نے ان دونوں اعتراضات کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ایک مقالہ تحریر کیا جو ۳۴ء میں جامعہ ملیہ دہلی کی ایک علمی انجمن میں پڑھا گیا، پھر مزید تحقیق و تفصیل کے ساتھ الندوہ ۴۱ء میں کئی ماہ اس موضوع پر لکھتے رہے، انہی مضامین کو اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اصرار سے "حدیث نبوی کے اولین صحیفے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

اپنی اس کتاب میں مولانا نے بڑی جامع ترتیب کے ساتھ تدوین حدیث اور اس کے مراحل کا ذکر کیا ہے اور عہد رسالت کی تحریری کوششوں سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کے تمام ذخیرہ کو خوبصورتی کے ساتھ اس کتابچہ میں جمع کر دیا ہے۔ اختتام پر لکھتے ہیں:-

"مکثرین صحابہ کی تقریباً پچیس ہزار روایتوں کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے جو ان کے سامنے

ہی تحریر کا قالب اختیار کر چکی تھیں۔ سطور بالا میں چند اور مشہور صحابہ کے تحریری مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً ہزارہا حدیثوں پر مشتمل تھے، لیکن یہ تعداد یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ انہیں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں خطوط کو بھی شامل کر لینا چاہیے جو انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمال، فوجی افسروں اور معلمین و مصلحین کے نام لکھے اور ان افسروں اور عاملوں کی جانب سے جو احکام و فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی روشنی میں لکھے گئے، اس طرح صحابہ کرام کے زمانہ ہی میں احادیث کے بہت سے مستقل اور بڑے بڑے کتابی مجموعوں کے علاوہ سارے اسلامی ممالک میں بے شمار تحریری روایتیں پھیلی ہوئی تھیں۔"

مولانا کی یہ کتاب اسی انداز پر لکھی ہوئی ہے جس میں ایک حقیقت کا اظہار نمایاں ہے نہ کہ کسی اعتراض کا جواب اور بلاشبہ وہ اپنی اس خصوصیت میں منفرد ہیں۔ ان کے اس طرز نگارش نے اس سلسلہ میں جو اصلاح و انقلاب برپا کیا ہے وہ اس موضوع پر بڑی بڑی بحثوں اور فلسفیانہ کتابوں کے اثر سے کہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں رد انکار حدیث پر ان کی خدمات کا احاطہ مقصود نہیں ہے محض اس پہلو کو اجاگر کرنا ہے کہ ندوۃ العلماء کے یہ معتمد تعلیم اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے یہ قائد کس پایہ کے عالم تھے۔ افسوس ہے کہ پہلے ہی یہ امت ایجابی طرز فکر اور مثبت طریق عمل سے دور ہے اور اس طرح کی شخصیتوں کے اٹھ جانے سے مزید خلا پیدا ہو رہا ہے جس کا پر ہونا مستقبل قریب میں تو محال سا نظر آتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگزر فرمائے۔ امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

فما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدم

(قیس کی موت ایک فرد کی موت نہیں ہے بلکہ اس کی موت سے قوم کی عمارت گر پڑی ہے)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی تاریخی خدمات

(سید مشتاق علی ندوی، بھوپالی)

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ نے علمی و سائنسی بنیادوں پر ترقی کی منزلیں طے کیں جس سے اس کا نیا تمدن، نئی تہذیب وجود میں آئی تو یورپ کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح اقوام عالم اور خاص طور پر ان قوموں کو جن سے اس کو اپنے آشیانہ کے مستقبل ہی کے بارے میں خطرہ تھا جن میں اس کی نظر اسلام اور مسلمانوں پر سب سے پہلے ٹھہری، کو اپنی تہذیب کا گرویدہ اور اپنے تمدن کا پابند بنایا جائے اور ان کے دلوں میں اپنی اور اپنی قوم کی برتری اور بلندی کا نقش اس طرح ثبت کیا جائے کہ انکو ان کی تہذیب و تمدن، ان کے اسلاف اور ان کے کارنامے اور ان کا مایۂ افتخار بے حقیقت ہی معلوم نہ ہو بلکہ وہ اس سے متنفر، بیزار اور دور ہو جائیں، اور کیونکہ یورپ طویل و تلخ تجربات اور خاص طور پر تاتاری اور صلیبی جنگوں سے اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ مسلمانوں کو صراحتاً اور کھل کر ایمان و عقیدہ، عشق رسول، محبت صحابہ کرام اور عقیدت علماء عظام سے خالی اور دور کرنے کی دعوت دینا خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے، دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کے مرادف ہے۔

چنانچہ یورپ نے اب اپنی کوششوں بلکہ سازشوں کے لئے نیا میدان کار بنایا اور ایک نیا حربہ استعمال کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی شاندار و آبدار تاریخ کو داغدار اور عیب دار بنایا جائے اور ان کے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں، ان کی فتوحات مادی و معنوی، جسمانی و روحانی کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ کم از کم ہمارے محکوم ملکوں، آئندہ آنے والی نسلوں اور عوام میں بدگمانی و سوءظن بلکہ نفرت و بیزاری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اپنے کو ان کی طرف منسوب کرنے میں بجائے عزّ و شرف کے ذلّت و عار محسوس کریں اور بے الفاظ میں انکار پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اس طرح ان کا تعلق ان کے اصل سرچشمۂ حیات اور منبع روح سے کٹ جائے پھر ان سے جو چاہیں گے کروائیں گے اور جہاں چاہیں گے استعمال کریں گے۔

چنانچہ مورخ اسلام سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ہندوستان میں یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور اس کے علمبردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے اسکے بعد سر ولیم میور آئے اور پھر سلسلہ جاری رہا۔ انگلستان اور فرانس اور جرمنی میں یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا۔ ڈاکٹر جے۔ اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھائی، حر ۱۳۱

جائے کہ مسلمانوں کے دلوں سے ان کی محبت و عقیدت ختم ہو جائے۔

تو مولانا مرحوم نے وقت کی ضرورت اور غیرت دینی کا تقاضہ سمجھا کہ عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں ان ستاروں کے کارنامے اور ایک حد تک ان کی زندگی کا رُخ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، چنانچہ آپ نے "مثالی حکمراں" کے نام سے ایک چھوٹی سی لیکن بہت ہی وقیع و اہم تصنیف مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دی کہ وہ کسی طرح کے دھوکے اور احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اس میں مولانا نے بڑی خوبی اور بہت اچھے انداز میں یہ بات واضح کی کہ اے اخوت و مساوات، ایثار و ہمدردی، علم و حکمت کے دعویدارو! تمہاری زبان پر صرف یہ الفاظ ہیں جو کہ کبھی حلق سے نیچے نہیں جاتے، لیکن ایک ہمارے اسلاف تھے جنھوں نے اعلان اور نعرے بازی تو کبھی نہیں کی لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دنیا کے سامنے ایسی عملی مثالیں پیش کیں جو تاریخ میں سنہری حروف سے تحریر کئے جانے کے قابل ہیں۔ اور کہیں کہیں تو مولانا کا قلم سیال کا دھارا بہت تیز ہو جاتا ہے اور پورے ایمانی جوش اور مؤرخانہ ہوش سے تیر و نشتر کی بوچھار کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو قحط پڑا تھا اور اس میں حضرت عمرؓ کا جو رویہ رہا اور کس طرح وہ پورے زمانۂ قحط میں دیدۂ بے خواب اور ماہی بے آب بنے رہے اور کس طرح انہوں نے رعایا کے دکھ درد، تکلیف و مصیبت میں ساتھ دیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مرحوم کا قلم سیال رواں ہوتا ہے۔ "غور کیجئے اے کوئی فرمانروا جس کا یہ مطمح نظر ہو، جو رعایا پروری کا یہ بلند نصب العین رکھتا ہو اور جو اخوت و مساوات کا ایسا گہرا جذبہ رکھتا ہو۔ بلند بانگ دعوے آپ نے بہت سنے ہوں گے۔ پرزور نعرے بارہا کانوں میں گونجے ہوں گے۔ لیکن سچ بتائیے رعایا پروری کے یہ واقعات کسی حکمراں کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور اسلام کے سوا اخوت و مساوات اور ہمدردی و غمگساری کی مثال کہیں اور بھی پائی جاتی ہے؟"[1]

خلفاء اربعہ کے بعد ان مفسدین کی پوری کوشش و محنت اس پر صرف ہو رہی تھی کہ شاہانِ اسلام اور ان کی سلطنتوں کا ایسا نقشہ اور خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کہ اس کے دیکھنے سے نفرت ہو اور جس سے ان کی نا اہلی، بے علمی کا نقش دلوں پر بیٹھ جائے اس کے لئے انہوں نے عام فہم اور سادہ و سلیس اسلوب میں تاریخ کو مرتب کر کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل کرنا شروع کیا کہ اگر یہاں یہ بیج ڈال دیا گیا تو پھر زندگی بھر برگ و

[1] مثالی حکمراں ص ۳۳

بار لاتا رہے گا اور نقش کالحجر ہوگا۔ مولانا عبدالسلام مرحوم نے اس سم قاتل کے مضرات اور خطرات کا اندازہ کیا اور اس کے تریاق کی جستجو میں لگ گئے، چنانچہ مولانا مرحوم نے سادہ، سہل اور دلچسپ و پسندیدہ اسلوب میں "ہماری بادشاہی" کے نام سے مختصر تاریخ اسلام مرتب کی تاکہ بآسانی مدارس و مکاتب، اسکولوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہو سکے اور نئی نسل کو صحیح معلومات فراہم ہوں اس میں مولانا نے صرف واقعات و فتوحات اور حادثات پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں، "موقع موقع سے ان کی قومی نخوت اور مذہبی غیرت کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ تاریخ کا فائدہ حاصل کریں"[1]

اس کی مثالیں کتاب میں جگہ جگہ ملتی ہیں مثلاً مولانا مرحوم اسلام نے عربوں میں جو انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا اور جو کایا پلٹ ہوئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "ایمان کی قوت نے ہمت بلند کر دی، وہی مفلس و قلاش اور غریب و لاچار عرب جن کی ساری زندگی بکریوں کی چرواہی اور اونٹوں کی دیکھ بھال میں بسر ہوئی تھی، بادشاہت و سلطنت کے ارادے کرنے لگے"۔

پھر اس کے بعد آگے چل کر بڑے جوش، بلکہ سنجیدگی اور ایمانی قوت سے سوال کرتے ہیں "سوچنے کی بات ہے کہ آخر چند برس میں یہ کایا پلٹ کیونکر ہو گئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا وہ کون ذات تھی جس نے ساری دنیا بدل دی"۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "لوگ حیران ہیں کہ ایکبارگی یہ کیا ہو گیا، لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی ایسی زبردست تھی جہاں ایک بار اسلام کا اثر ہوا اور اللہ کا خیال دل میں جما، پھر کیا تھا ساری دنیا قدموں کے نیچے تھی، وہ اللہ کے ہو گئے تھے اللہ اُن کا ہو گیا تھا"[3]

حضرت عمرؓ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ زہد و ورع، عبادت و ریاضت، اخوت و مساوات، سادگی و تواضع کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نوک قلم سے یہ الفاظ آشنا ہوتے ہیں۔ "خیال کرنے کی بات ہے کہ عرب و عراق، ایران و شام اور مصر جیسے ملک جس خلیفہ کے قبضہ میں رہے ہوں اس کی زندگی ایسی سادہ ہو"[4] کہیں کہیں اس میں مولانا مرحوم نے مرض کی تشخیص بھی کی اور ان مہلک و تباہ کن بیماریوں سے بچنے کی دعوت

۱۳۲

[1] دیباچہ ہماری بادشاہی۔ [2] ایضاً ص ۲۵، [3] ایضاً ص ۴۰، [4] ایضاً ص ۴۳

سینٹ ہلیر، نولدیکی، ولہاؤسن، گولڈ زیہر، اینان وغیرہ یہ کام انجام دیتے رہے اور سب سے آخر میں پروفیسر مارگیولیوتھ اٹھے اور اس کا بیڑا اٹھایا[1] ادھر عیسائیوں نے خود مسلم ممالک کے اندر یہ کام شروع کیا جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال ان میں قابل ذکر ہیں۔

چنانچہ اس عظیم دوررس اور پُر فریب فتنہ سے عالم اسلام اور مسلمانوں میں جو ادارہ سب سے پہلے برسرپیکار ہوا وہ ندوۃ العلماء تھا جہاں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۳۳۲ھ) نے "تصحیح اغلاط تاریخی" کے نام سے ایک شعبے کی بنیاد رکھی اور اس کا سکریٹری اپنے ہونہار شاگرد رشید علامہ سید سلیمانؒ کو مقرر کیا، اور الجزیہ، الفاروق، المامون، سیرت النعمان وغیرہ کے ذریعہ ان مستشرقین کے تمام راستے بند کر دیے کہ ان کو آنکھ اٹھا کر بات کرنے اور منھ ملانے کا موقع ملے، ادھر سید صاحب نے اپنی صلاحیت و لیاقت سے اپنے استاد کے کام کو پروان چڑھایا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ اس فتنۂ عظیم سے مقابلہ کے لئے ایک پوری ٹیم تیار کر دی کہ وہ اس کا دندان شکن اور حوصلہ شکن جواب دیتی رہے چنانچہ شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابوظفر ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی قدوائی انہی کے حلقۂ فیض سے فیضیاب ہوئے۔ اور زمانے کے فتنوں کا جواب دیتے رہے۔

چونکہ مستشرقین اور یورپی اہل قلم نے سب سے پہلے سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو مورد الزام ٹھہرایا تھا اور آپؐ کی ذات والاصفات کو اس طرح پیش کیا کہ دیکھنے والے کے سامنے آپ کی اصلی تصویر کا ایک رُخ بھی نہ آئے تو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے اس کو محسوس کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے اور آپ نے دنیا پر جو انعامات و احسانات کئے ان کو پیش کرنے کی کوشش کی، چنانچہ مولانا مرحوم نے بڑی محنت و کاوش اور عرق ریزی سے "دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی، مولانا نے اس میں بہت ہی خوش اسلوبی سے یہ ثابت کیا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو دنیا اعلیٰ صفات، بلند مقاصد، صحیح اغراض سے بالکل نابلد و بے خبر رہتی، آپؐ کے دنیا پر اور انسانیت پر وہ احسانات ہیں جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بعد ان دجالین مغرب کا رُخ خلفاء اربعہ کی طرف تھا کہ کسی طرح ان کو اور ان کی حکومت کو ظالم و جابر ثابت کر دیا جائے اور ان کے زندہ جاوید کارناموں پر ایسا پانی پھیر دیا

۱۳۹

[1] حیات شبلی ص ۲۳

دی، مثال کے طور پر اندلس کا ذکر بڑے گہرے رنج و افسوس اور حسرت بھرے الفاظ میں کرتے ہوئے کہتے ہیں، "غرض تھوڑے ہی عرصے میں سارا اندلس مسلمانوں سے صاف ہو گیا اور ایک آدمی بھی اللہ کا نام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والا باقی نہ رہا، اور یہ سب آپس کی نااتفاقی کی بدولت ہوا"[1]

مولانا مرحوم نے ہماری بادشاہی کے بعد اسی اسلوب میں الگ سے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی جو "مختصر تاریخ ہند" کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے، یہ بھی مولانا کی ایک اہم خدمت ہے جو آپ نے مسلمانوں کے لئے انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند اور مسلمانانِ عالم کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین اور ان کے اخلاف میں ان کے جانشین پیدا فرمائے جو کہ ان کے کام کو آگے بڑھائیں اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے تاج محل تعمیر کریں۔ واللہ ھوالموفق۔

اسلام کامل

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دین و دنیا کی راہبانہ تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحہ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے۔ اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں، آج جو فتنے اٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جب کہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

---

[1] ہماری بادشاہی صفحہ ۱۳۰

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات

برادر محترم مولانا حاجی عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم

از مصطفےٰ علی آسیر لکھنوی (ذاکر نگر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

حیف ہے صد حیف ہے ہم سب سے رخصت ہو گئے — ندوۃ العلماء کے عالم باعمل عبدالسلام
سنّت نبوی پہ عامل، متقی پرہیزگار — عابد پُر شوق زاہد بے ریا شیریں کلام
پاک صورت نیک سیرت پیکر انسانیت — مخلص و ہمدرد سب کے خاصۂ ربّ الانام
زائر حرمین ہونے کا شرف حاصل ہوا — فضل حق سے باطفیل رحمتِ خیر الانام
ذات تھی ان کی اہم دینی اداروں کے لیے — غم زدہ کیسے نہ ہوں فرقت میں علمائے کرام
تیسویں تاریخ ہجری عیسوی چوبیس اگست — جمعہ کا دن حامل اکرام رب ماہِ صیام
دوپہر قبل از زوال آیا فرشتہ موت کا — چل بسے مقبول خاص و عام مشہور الانام
فجر تک قائم رہے ان کے حواس و ہوش سب — ہو گئے بے ہوش پھر پی کر مئے عرفاں کا جام
نزع کا عالم ہوا طاری تو ایسے حال میں — نور تھا چہرے پہ لب پر کلمۂ حق لا کلام
آرزو تھی ان کی یہ مٹی وطن کی ہو نصیب — خوش نصیبی تھی کہ اپنے باغ میں پایا مقام
دل شکستہ مصطفیٰ کی رات دن ہے یہ دعا — رحمتِ رب با ابو بھائی کی لحد پر ہو دوام

مصرع تاریخ آیا "لوح زیبا" کو لیئے
جنت الفردوس میں جنت نشیں عبدالسلام[64]
۶۴ + ۱۹۱۵ = ۱۹۷۹ء

دیگر

اٹھی ہے دنیا سے کون ہستی بچشم گریاں ہر آدمی ہے
ہے کس کا ماتم چہار جانب یہ تھو لیٹی میں شور کیسا

ندا یہ آئی وہ مردِ مومن وہ آشنائے رموزِ ہستی
شریعت احمدی پہ عامل خدا تعالےٰ کا خاص بندا

رہا جو بندوں کے ساتھ شامل رہا جو اپنے خدا سے واصل
وہ سوئے ملکِ عدم گیا ہے ملا ہے اس کو مقام اعلا

ہیں رنج و غم سے نڈھال سارے رہے جو اس کو عزیز ہر دم
سبھی کو حیرت سبھی پریشاں کیا ہے اس نے سفر کہاں کا

مکین دنیا سنیں یہ دل سے برائے تاریخ سالِ رحلت
صدائے رضواں یہ آرہی ہے سلام باغ جناں میں پہنچا

مولانا قدوائی کے حادثۂ انتقال پر

عامر قدوائی

اب کے گھٹا کچھ اور ہی گھنگھور چھا گئی
بارش تمام شہر کی رنگت اڑا گئی

آنگن کی ساری دھوپ مرے سر پہ آگئی
ایسی ہوا چلی ہے کہ دیوار ڈھا گئی

بستی کے سارے لوگ ابھی تک ہیں اشکبار
آندھی جو ایک بوڑھے شجر کو گرا گئی

سائے کی شفقتوں سے بھی محروم ہو گئے
جس چھت کے نیچے بیٹھے تھے وہ آج ڈھا گئی

اب تک فضا ہے درد کی چیخوں سے ہولناک
آخر اجل یہ کون سا منظر دکھا گئی

اب ہم کہاں سے لائیں گے چہرے کی تازگی
ہم کو تو اور دھوپ غموں کی جلا گئی

دیکھا جو اب کی بار اُسے ہم نے گاؤں میں
عامر کی آنکھ دیکھتے ہی ڈبڈبا گئی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

ضیاء الرحمٰن اعظمی

وہ عبدالسلام، آہ وہ مردِ کامل — وہ بالغ نظر، سالکِ راہ منزل
وہ اک عالمِ دیں، چراغِ ہدایت — وہ پروانۂ شمعِ روئے رسالتؐ
خدامست تھا وہ، خود آگاہ تھا وہ — حقیقت میں دل کا شہنشاہ تھا وہ
شرافت کا ماہِ مبیں تھا وہ گویا — محبت کا چرخِ بریں تھا وہ گویا
اسے لالہ و یاسمن کیوں نہ کہئے — بہاروں کا رنگیں چمن کیوں نہ کہئے
نگاہوں میں اک دلنوازی بھری تھی — حرم کی طرح پاک بازی بھری تھی
تھی سیرت بڑی باصفا اللہ اللہ — تھا وہ کس قدر بے ریا اللہ اللہ
ہمیں شانِ مومن بتانے کی خاطر — حقیقت سے پردہ اٹھانے کی خاطر
روایاتِ ناقص مٹاتا رہا وہ — ستاروں کی محفل سجاتا رہا وہ
ہمیں عشق کا پھر وہی راز بخشا — وہی سوز بخشا، وہی ساز بخشا
جگر میں وہی تیر پھر سے چبھویا — دلوں میں تمنّا کے پھر بیج بویا
زباں کی روانی نہ دیکھی تھی پہلے — وہ جادو بیانی نہ دیکھی تھی پہلے
بڑا پرکشش اس کا طرزِ سخن تھا — نہاں سادگی میں بھی اک بانکپن تھا
کھری، پُروقار، اور بلند اس کی باتیں — تھیں سارے جہاں کو پسند اس کی باتیں
نہ بھولے گی اس کی زباں ہم کو برسوں — نہ بھولے گا وہ مہرباں ہم کو برسوں

وہ روشن ستارہ چمکتا رہے گا
نگاہوں میں ہر دم دمکتا رہے گا

۳۳۶۵
۵۴۰۴۱

تاثرات

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ملک کے ممتاز و مشہور اہل فکر و نظر میں تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ رہے اور اپنے طلبہ میں بہت محبوب و مقبول، ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا، اور نہ جانے کتنے لوگ اس سے مستفید ہوئے۔ رسالہ تحریک کی ادارت میں شریک رہے۔ الندوہ کی ادارت میں شریک رہے، جامعہ ملیہ میں استاذ اور ناظم دینیات رہے، ندوہ کے معتمد تعلیم اور اسلام اور عصر جدید سوسائٹی کے ممبر رہے اور اخیر میں دارالمصنفین میں مسند شبلی و سلیمان تک پہنچے، اس طویل زندگی اور متنوع سرگرمیوں میں ہندوستان کے ہر حلقے کے ممتاز اہل دانش و بینش کے ساتھ تعلقات رہے۔ اور ان کے انتقال کے موقعہ پر ملک کے بے شمار لوگوں نے اپنے رنج و غم اور ان کی ذات و خدمات کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اس طرح کے تعزیتی خطوط کئی جگہ بٹ گئے، ایک بڑا حصہ ان کے صاحبزادوں اور خاندانی عزیزوں کے نام کیا جو ہمیں نہیں مل سکا۔ کچھ خطوط حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور کچھ مکرمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (دارالمصنفین) کے نام آئے۔ ہمیں جو خطوط مل سکے، ان کے اقتباسات یہاں دیئے جا رہے ہیں، ان میں اکثر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام پر اور کچھ حضرت مولانا علی میاں کے نام۔ (مرتب)

میں کن لفظوں میں آپ سے تعزیت کروں کہ خود ہی تعزیت کا مستحق ہوں، دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں بلکہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پورا حلقۂ عقیدت متاثر و قابلِ تعزیت ہے، اور کیا عرض کروں۔

تن ہمہ داغ داغ شد — پنبہ کجا کجا نہم

ابوالحسن علی ندوی
صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام مکتوب

مولوی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، عالم، سمجھ دار، بااخلاق، منکسر مزاج، متواضع بزرگ تھے، آپ کو مولوی صاحب کے اعظم گڑھ آجانے سے تقویت تھی، آپ کے پاکستان کے طویل قیام کے دوران میں دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ، جگہ خالی ہوگئی، جانشین ملنا آسان نہیں۔

عبیدالرحمٰن شروانی

(بذریعہ تار) مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات سے انتہائی مغموم اور رنجیدہ ہوں۔

محمد عمران خاں ندوی

بھوپال

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی اچانک رحلت کی خبر سُن کر قلب پر چوٹ لگی پہلے سے ان کی علالت کی خبر نہیں تھی، اور شاید علیل رہے بھی نہیں، افسوس دارالمصنفین ایک فاضل مخلص اور بے لوث عالم دین اور بہت اچھے انشار پرداز سے محروم ہوگیا، مرحوم غیر معمولی خصوصیات اور کمالات کے امین تھے، پیکر اخلاق وانکسار، مجسم تواضع، ذہنی اعتبار سے نہایت متوازن، اپنے مسلک میں مضبوط اور دوسرے مسلکوں کے لئے کشادہ دل، یہ ہمارے اندازوں کی غلطی تھی اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مرحوم ابھی بہت دنوں تک علم وادب کی خدمت کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ازراہِ کرم تعزیت قبول فرمائیں۔

(مفتی) عتیق الرحمٰن عثمانی

صدر مسلم مجلس مشاورت

برادرم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کی وفات کی خبر مجھ کو عید کے دن ملی، دل کو بڑا صدمہ ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور جملہ متعلقین اور احباب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

مرحوم سے اس دن آپ کے ساتھ ملاقات ہوئی تو ماشاء اللہ صحت مند تھے، ان کا خلوص ومحبت سے ملنا ابھی تک یاد ہے، کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے، اور اس دن کی ان سے ہماری آخری ملاقات ہوگی۔

ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے، آج وہ تو کل ہماری باری ہے، وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیاب کے ساتھ مراحلِ حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لئے روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوض کوثر پر اُس دن ملادے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پالے گا، اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

محمد یوسف

امیر جماعت اسلامی ہند

دارالعلوم ندوہ کے لئے یہ تیسرا زبردست حادثہ ہے، اور دارالمصنفین کے لئے بھی۔

میں آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، اور ان کے گھر کے لوگوں کو اور ان کے احباب ومخلصین کو صبر وسکون عطا کرے، آمین!

محمد امان اللہ قادری

پھلواروی

مشیت الٰہی یہی تھی اور رمضان مبارک کی رحمت ومغفرت اور رستگاری جہنم سے نوازنے کے لیے ان کو رمضان مبارک کے آخری دن جمعہ کے روز بلالیا گیا، اور وہ رحمت ومغفرت کی چادروں میں ڈھانک لئے گئے، سچ ہے اور کہنے والے نے بالکل سچ کہا ہے۔

رحمت حق بہانہ می جوید　　رحمتِ حق بہانہ می جوید

مولانا بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی تھے، اور خاموشی کے ساتھ بہت مستحکم اور ٹھوس کام کرتے تھے، میری ملاقات اُن سے اس وقت سے تھی جب وہ دہلی جامعہ ملیہ اور تعلیماتِ اسلام وغیرہ میں تھے، اور بڑی بے تکلفانہ گفتگو مجھ سے فرماتے تھے، ادھر جب بھی ندوہ یا دارالمصنفین میں ملاقات ہوتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اور محبت وشفقت سے باتیں کرتے، شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور میرے یہاں کے شاہ عزالدین صاحبؒ اور مولانا قدوائی ایک ہی دور کے ندوی تھے، افسوس کہ ان میں سے کوئی نہ رہا۔

ع :- افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

عون احمد۔ پھلواری شریف

میں رمضان بعد ہی سے آپ کے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا اور قدرۃً اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس موقع پر مولانا عبدالسلام صاحب سے بھی ملاقات ہوگی اور ان سے ہم کلام ہونے کی مسرت حاصل ہوگی، لیکن کل شام "دعوت" سے یہ معلوم کر کے کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس ہے کہ ہمارے لائق افراد کے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں، اور بظاہر ان کی جگہ لینے والے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر رحم فرمائے،

ندوہ کے لئے تو خاص طور سے ایک سنگین حادثہ ہے، ابھی دو زخم تازہ ہی تھے کہ تیسرے حادثہ سے بھی اسے دوچار ہونا پڑا۔

(مولانا) ابواللیث ندوی

لیجئے ہمارے اور آپ کے مولانا بھی آپ کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور آپ کے لئے نئی آزمائشیں آکھڑی ہوئیں، یہ آپ کا ذاتی غم تو ہے ہی دارالمصنفین کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے اور چونکہ آپ اور دارالمصنفین ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس لئے یہ دُہرا اور کاری زخم ہے جو آپ کو لگا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور قوت دیں کہ آپ اس غم کو مردانہ وار جھیل لے جائیں۔

مولانا علی میاں صاحب کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، محمد الحسنی مرحوم اور اسحاق جلیس مرحوم کا غم ہی کیا کم تھا کہ تیسرا چرکہ ان کو لگا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم لوگوں پر قائم رہے۔

اہل جامعہ بھی مولانا مرحوم کی وفات سے بہت متاثر ہیں، آپ واقف ہیں کہ انھیں جامعہ اور اہل جامعہ سے کتنا گہرا تعلق تھا۔

ضیاء الحسن فاروقی

مرحوم عبدالسلام قدوائی صاحب سے مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا، ان پر ندوہ اور جامعہ دونوں کی چھاپ تھی، صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے اور اس دور میں جن علماء کو ہم واقعی روشن خیال کہہ سکتے ہیں، ان میں مرحوم کا بھی شمار ہوتا ہے، آپ کے تو رفیق کار تھے اور دارالمصنفین کے کاموں میں آپ کے ساتھ تھے، ان کی پُروقار شخصیت اور ان کے چہرے کی مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے رمضان المبارک میں موت بھی خوش نصیبوں ہی کا حصہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، ان کے پسماندگان کو اور آپ جیسے ان کے رفقائے کار کو صبر جمیل عطا کرے۔

معین الدین حارث

(صدر انجمن اسلام بمبئی۔ چیرمین حج کمیٹی)

وہ میرے بھی دیرینہ کرم فرما تھے، نہایت منکسر المزاج اور صاحب کمال تھے، آپ کے دوست اور مددگار تھے، ان کی دائمی جدائی سے آپ کو بھی صدمہ ہوگا، اللہ پاک صبر کی توفیق عنایت فرمائیں اور اجر عظیم بھی عنایت فرمائیں، جو صاحب کمال اٹھ جاتا ہے، اس کی جگہ خالی رہتی ہے، نعم البدل کم ہی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اللہ پاک مرحوم کو سایۂ رحمت میں مقام عنایت فرمائیں اور حبیب اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کے مراتب بلند فرمائیں۔ آمین ثم آمین

مولانا اخلاق حسین دہلوی

لال محل۔ بستی حضرت نظام الدین اولیا نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

میرا مرحوم کے ساتھ سترہ سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رفاقت کا تعلق رہا، کبھی ان کی طرف سے کوئی بات ناگواری خاطر کی پیش نہیں آئی، محبت و اخلاص کا پیکر، اور رواداری و اعتدال فکر و نظر کا مجسمہ تھے، انہی اوصاف و محاسن کی وجہ سے جامعہ میں ان کے احباب اور نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں جگہ سہارا دیا اور اپنے بزرگوں کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صدر مرکزی دینی تعلیمی بورڈ۔ دہلی

موصوف اپنے علم وفضل کی پختگی اور اعتدال فکر کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے، انتقال کے لئے بڑا اچھا وقت پایا، یہ ان کے اعمال حسنہ کی مقبولیت کی ایک علامت ہے کہ رمضان کے ماہ رحمت نے انھیں اپنی آغوش میں لیا۔ میں اہل علم حضرات کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتا ہوں حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور آپ سب حضرات کو صبر جمیل اور ان کا نعم البدل عنایت ہو۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر
دارالعلوم دیوبند

مولانا جہاں بھی رہے، ندوہ، جامعہ اور بالآخر دارالمصنفین میں، ہر جگہ انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ ان کی نیکی، ان کی شرافت، ان کی سادگی، ان کا علم وفضل، ایک ایک کرکے سبھی چیزیں یاد آتی ہیں، جامعہ میں ان کے جمعہ کے خطبے لوگوں کو بہت پسند تھے، لوگوں کو انتظار رہتا تھا کہ مولانا آئیں تو ان کے خطبے سننے کو ملیں، وہ بہت تکلف کرتے، فرماتے کہ یہ مستقل امام کا حق ہے، ان ہی کو نماز پڑھانی چاہئے اور خطبہ دینا چاہئے، مگر جب خود امام صاحب اصرار کرتے تو وہ مجبور ہوجاتے، افسوس کہ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے فاضل اور دارالمصنفین کے رفیق سے ہم لوگ محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی نیک صفات اور مخلصانہ خدمات کے عوض میں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

عبداللطیف اعظمی

اس واقعہ کا آنجناب پر جو اثر ہوا ہوگا اور مرحوم کے انتقال سے دارالمصنفین میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اس کا بخوبی اندازہ ہے مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارۂ کار ہی کیا ہے، اس لئے خود صبر وضبط سے کام لے کر دوسرے رفقاء کو بھی تلقین صبر کیجئے۔ یقیناً مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے اور آپ کو ان کی وجہ سے جو تقویت وسہارا تھا اس کا بھی نعم البدل دشوار ہے ازراہ کرم جملہ رفقائے دارالمصنفین کو میرے کلمات تعزیت پہنچا کر تلقین صبر فرمادیں اور دعاء فرمائیں کہ اللہ پاک مرحوم کی تربت کو نور سے معمور فرماکر انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ میں بھی آج اپنے ایک شفیق استاد کی پدرانہ محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

اقبال انصاری

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے انتقال کی خبر سنکر مجھے بے حد صدمہ اور رنج ہوا، مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی، جب میں نے لائبریری میں ملازمت حاصل کی۔ جس لطف ومروت اور خوش خلقی سے مولانا مرحوم نے مجھ سے گفتگو کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی، اس کے بعد جب تک مولانا یہاں رہے اکثر وبیشتر ملاقات کے مواقع ملتے رہے، ان کے جیسا عالم باعمل کم ہوتا ہے، مرحوم مجھ پر بے حد کرم فرما تھے۔

شہاب الدین انصاری
لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات کی اچانک خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا، خداوند تعالیٰ ان کی یقیناً مغفرت فرمائے گا، اس درجہ نیک، مخلص، اور صالح دل ودماغ کا مالک انسان مشکل ہی سے مل سکے گا، ایسے ہی عالم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔

عتیق صدیقی
جامعہ نگر دہلی

مولانا مرحوم ندوہ کے قدیم فضلاء میں سے تھے، پوری زندگی دینی اور علمی کاموں میں بسر کی، ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی کچھ دنوں اخبار خلافت بمبئی میں رہے، پھر ندوہ میں مدرس ہوئے اور لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کرکے اس کی طرف سے تعمیر کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔ آخر میں جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاذ ہوئے، اور کافی مدت وہاں گزاری۔ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور نہایت شوق وذوق اور انشراح کے ساتھ یہاں کے علمی کاموں میں شریک رہے۔ اخلاق، مروت، شرافت خوردہ نوازی، بے تکلفی، مجلسی آداب غرض کہ ہر خوبی کے جامع بزرگ تھے، دوسروں کی طرح راقم سے بھی اسی خلوص ومحبت سے ملتے تھے، بلکہ بعض اوقات غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، وہ بڑے تھے مگر کسی پر اپنی بڑائی ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو کیا کرتے تھے، باوجودیکہ ان کا انداز گفتگو معصومانہ تھا۔ مخاطب کو متاثر کرلیتے تھے غرض کہ مختلف اوصاف